فلسفۂ اسلام یا علم کلام

تحقیق و تصنیف

فیلسوف اسلام علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ

تہذیب و تذہیب

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا میثم زیدی



فہرست کتب علامہ عدیل اخترؒ

- تسکین الفتن فی صلح الحسنؑ
- تدلیس شبلی
- علمی خیانتیں
- صلۂ تاریخ احمدی
- مسئلہ تقیہ
- دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر
- فلسفۂ اسلام یا علم کلام
- اصحاب الیمین واصحاب الشمال

التماس ترحیم

مجاہد ملت، ہمدرد قوم، سربراہ تحریک تعلیم نسواں، بانیٔ جامعۃ الزہراؑ

حجۃ الاسلام والمسلمین

مولانا سید حیدر مہدی زیدی اعلی اللہ مقامہ

جنکے دینی خدمات خصوصاً مدارس دینیہ کی تاریخ میں بے مثال اور ناقابل فراموش ہیں

ناشر

مکتبۂ افادات علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ

۵۴۶/۱۳۰ سرفراز گنج لکھنؤ۔۳ (ہندوستان)

موبائل: ۹۳۱۵۳۹۵۴۹۲/۹۹۵۶۹۶۳۶۲۲

سلسلہ اشاعت آثار فیلسوف اسلام علامہ عدیل اختر (۲)

فلسفۂ اسلام یا علم کلام

تحقیق و تصنیف

فیلسوف اسلام علامہ سید عدیل اختر زیدی اعلی اللہ مقامہ

۱۳۱۵ھ ——— ۱۳۷۰ھ

(سابق پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ)

تھذیب و تذھیب

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا میثم زیدی

نام کتاب .... فلسفۂ اسلام یا علم کلام

تحقیق و تصنیف .... فیلسوف اسلام علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ

تہذیب و تذہیب .... حجۃ الاسلام مولانا میثم زیدی

کمپوزنگ .... مولانا فصاحت حسین

تاریخ طباعت .... فروری ۲۰۱۱ء

ناشر .... مکتبۂ افادات علامہ عدیل اختر

ایڈیشن .... باراول

مطبع .... امپریشن پرنٹنگ پریس لکھنؤ

تعداد .... ایک ہزار

قیمت .... ایک سو روپے

ملنے کے پتے

۱۔ میثم زیدی 130/546 نزد ارا میڈیکل کالج

سرفراز گنج لکھنؤ۔226003

۲۔ دفتر ماہنامہ ''اصلاح'' مسجد دیوان ناصر علی

مرتضیٰ حسین روڈ لکھنؤ۔226003

۳۔ پروفیسر جون زیدی

اورینٹل کالج، پٹنہ۔800008

فہرست

فہرست کتب علامہ عدیل اختر

تسکین الفتن فی صلح الحسنؑ

تدلیس شبلی

علمی خیانتیں

صلۂ تاریخ احمدی

الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان مسئلہ تقیہ

دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر

فلسفۂ اسلام یا علم کلام

اصحاب الیمین

ناشر

مکتبۂ افادات علامہ عدیل اخترؒ

۱۳۰/۵۴۶ سرفراز گنج لکھنؤ۔۳ (ہندوستان)

بتدائیہ

فیلسوف اسلام علامہ سید عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ کی ذات گرامی اور ان کے علمی خدمات صاحبان نظر کے لئے محتاج تعارف نہیں ۔ان کے قلم نے ہمیشہ سے فکر انگیز اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کیا ہے ۔ان کی مشہور کتابیں صلح الحسن، تدلیس شبلی ،مسئلہ تقیہ، علمی خیانتیں، صلۂ تاریخ احمدی، دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر وغیرہ علماءوا فاضل کے لئے علمی استفادہ کا ذریعہ بن چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب "فلسفۂ اسلام یا علم کلام" جد امجد طاب ثراہ کی معرکۃ الآرا تحقیق وتصنیف ہے جو اب تک تشنۂ طباعت تھی اور مختلف وجوہات کی بناء پر منظر عام پر نہ آسکی۔

الحمد للہ آج ہم اس کتاب کو تیار کر کے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کررہے ہیں ۔اپنی علمی کم مائگی اور جد امجد سے نسبت فرزندی مجھے اجازت نہیں دیتی کہ آپ کی علمی عظمت اور قلمی جلالت کے بارے میں اظہار خیال کرسکوں۔

پروردگار سے دعا ہے کہ علامہ مرحوم کو ان کے دینی خدمات کا بے پایاں صلہ مرحمت فرمائے ۔اور مجھے توفیق دے کہ انکے علمی ورثہ کی حفاظت نیز انکی تحریروں کو تشنگان علم وتحقیق تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرسکوں۔

شکر گزار ہوں اپنے استاد محترم استاذ الاساتذہ، فیلسوف عصر، حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید محمد شاکر نقوی صاحب قبلہ دام ظلہ العالی کا جنہوں نے اپنی

تحریر کے ذریعہ میری ہمت افزائی کی اور اپنے رشحات قلم سے ہمیں نوازا۔

نیز شکر گزار ہوں گرامی قدر دانشمند محترم جناب سید سعادت حسین رضوی صاحب کا، جنکے تعاون کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی ۔اور میں اس جگہ برادران محترم ڈاکٹر جون زیدی وڈاکٹر ابو طالب زیدی وہمشیرہ گرامی معلمہ اخلاق خواہر رباب زیدی کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کی قدم بہ قدم حوصلہ افزائی مختلف خدمات کی محرک بنتی رہتی ہے۔

یہ گرانقدر کتاب اپنے تمام ابتدائی مراحل طے کر کے طباعت کے لئے پریس کو جارہی تھی کہ اخی العلام، حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید حیدر مہدی زیدی اعلیٰ اللہ مقامہ کی ناگہانی رحلت نے چلتے قدم روک دیئے ۔اب اس جانگداز حادثہ کے بعد مولانا مرحوم اور فیلسوف اسلام طاب ثراہ کی نسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس مجاہد علم وعمل کے چہلم کی مجلس کے موقع پر اس کتاب کو علما وفضلا کی خدمت میں پیش کررہے ہیں

پروردگار سے دعا ہے کہ ہماری اس ادنیٰ خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اخی العلام طاب ثراہ کے لئے خیر جاریہ قرار دے۔آمین

خاکسار

میثم زیدی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

۲۷ فروری ۲۰۱۱ء

حالات مصنفؒ

ازجناب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ مرحوم

(سابق مدیر الواعظ)

ولادت ـــــــــ ۲۹ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ منگل کے دن اپنے وطن علی نگر پالی، ضلع (جہان آباد) گیا میں پیدا ہوئے اور تاریخی نام "عدیل اختر" رکھا گیا، آپ کا سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ابتدائی تعلیم ـــــــــ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں مولانا حافظ فرمان علی صاحب مرحوم سے حاصل کر کے مرکز علم و عمل لکھنؤ میں آئے، یہ وقت وہ ہے کہ لکھنؤ مٹے حال پر بھی اہل کمال سے چھلک رہا ہے، فقہ، اصول، منطق و حکمت، ریاضی و فلسفہ، کلام و ادب و معانی و بیان کے ماہر موجود ہیں اور شہر کے ہر گوشہ میں درس و تدریس کا چرچا ہے۔ مشارع الشرائع مدرسہ ناظمیہ میں مدارج علمیہ کی تکمیل فرمائی اور ممتاز الافاضل کی سند امتیاز خاص کے ساتھ حاصل کی۔ ممتاز الافاضل ہونے سے پہلے آپ الہ آباد یونیورسٹی کے اعلیٰ اسناد بھی حاصل کر چکے تھے، ناظمیہ مدرسہ میں درجہ فاضل کو ایک مدت تک آپ نے درس دیا اور سرکار نجم العلماء نے اس حسن خدمت کے صلہ میں جو سند عطا کی اسے مولانا نے اپنے لئے تاج عزت قرار دے کر تمام سرکاری اور غیر سرکاری اسناد میں معزز سمجھا۔

۱۹۱۹ء میں مدرسۃ الواعظین قائم ہوا۔ آپ پہلے طالب علم ہیں جنہوں نے افتتاح کے ساتھ مقاصد مدرسہ کو کامیاب بنایا۔ تین سال کی جدو جہد کے بعد ۱۹۲۱ء میں آپ اپنی جماعت میں سب سے اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہو کر مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور صوبہ بہار و بنگال آپ کا مرکز تبلیغ قرار پایا جہاں کبھی آپ کا تقرر منجانب مدرسہ قرار پایا وہاں کی مقامی زبان حاصل فرمائی، چنانچہ بنگال میں بنگلہ زبان حاصل کی۔ کچھ مدت کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع میں شدھی کا زور و شور ہوا۔ اس نازک فضا میں جس حسن و خوبی سے آپ نے مدرسہ کے مفاد کو کامیاب بنانے میں خدمات انجام دیں وہ آپ کے مخصوص کارناموں میں ہیں۔

۱۹۲۳ء میں آپ کو مدرسہ نے جزائر افریقہ میں فریضہ تبلیغ پر مامور کیا۔ قدیم ہندوستان کا صوبہ سرحد آپ کی واپسی کا بکمال شوق منتظر تھا۔ افریقہ سے واپسی کے بعد ہی باشندگان صوبہ سرحد کی دعوت پر مدرسہ نے مولانا کا مرکز تبلیغ پشاور مقرر کیا۔ یہاں کے زمانہ قیام میں مدرسہ نے کچھ مدت کے لئے تبت کے دور افتادہ علاقہ میں آپ کو مامور کیا اور آپ وہاں گئے اور باشندگان تبت کو اپنی مذہبی خدمات سے جس طرح مطمئن فرمایا وہ ایک مفید اور دلچسپ تبلیغی شاہکار ہے۔ جس کی روداد رسالہ الواعظ کے صفحات میں موجود ہے۔ فرقۂ نوربخشیہ کے خیالات کو صحیح مرکز پر قائم کرنا اور دہنان جماعت کے غلط اصول کو شکست دینا آپ کے تجربہ اور تدبر کی بہترین مثال ہے۔

یہاں سے واپسی کے بعد آپ اپنے مرکز تبلیغ صوبہ سرحد تشریف لائے اور ۱۹۲۶ سے ۱۹۳۶ تک کا زمانہ آپ نے اس ناہموار زمین کے ہموار کرنے میں صرف فرمایا۔ جون ۱۹۳۶ میں آپ کا تقرر بحیثیت وائس پرنسپل مدرسۃ الواعظین ہوا۔ اہل پشاور مولانا کے لکھنؤ آنے پر کسی طرح رضامند نہ تھے مگر حضرت نجم العلماء کے فرمان سے سپر انداختہ ہو کر رخصت کیا۔

آپ نے درس و تدریس کے نظام میں جدید اصلاحات پیش کئے اور اپنے

تجربات کی بناء پر نصاب تعلیم تبدیل کر کے لباس نو پہنایا اس عہدہ پر خدمت کو ایک ہی سال ہوا تھا کہ پرنسپل صاحب نے انتقال فرمایا اور ارباب حل وعقد نے آپ کے خدمات کی قدر دانی فرما کر پرنسپل کے عہدہ پر مقرر کیا۔ مولانا کا انتخاب عہدہ پرنسپل پر ہونے کا اعلان ہوتے ہی پراونشل شیعہ کانفرنس صوبہ سرحد انجمن امامیہ بنگش استرزئی صوبہ کوہاٹ اور دیگر اداروں نے مدرسہ کو اپنے بیانات تبریک سے مطلع کیا۔ جو الواعظ یکم جولائی ۱۹۳۷ء میں موجود ہیں

۱۹۳۶ء سے تا انتقال آپ حضرات واعظین کی تعلیم وتربیت فرماتے رہے۔ آپ کے صفات پر مختصر روشنی ڈالنے کے لئے اخبار سرفراز مورخہ ۲۱ فروری ۳۷ء کے ایک طویل مضمون کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

"آپ سب سے پہلے طالب علم ہیں جنہوں نے مدرسہ میں جماعت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور آج تک مدرسہ کی تحریری وتقریری خدمت انجام دیتے رہے، اخبار کا مطالعہ کرنے والے اور مدرسۃ الواعظین کے تبلیغی خدمات سے دلچسپی رکھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ موصوف نے ہندوستان کے علاوہ افریقہ اور تبت میں بھی تبلیغی خدمات انجام دی ہیں، موصوف اُردو فارسی وعربی کے ماہر ہونے کے علاوہ انگریزی، گجراتی، پشتو، پنجابی اور سواحلی زبانوں میں بھی بقدر ضرورت تحریر و تقریر فرما سکتے ہیں، موصوف نے مذاہب غیر کا غیر معمولی مطالعہ کیا ہے اور اس کے متعلق مفید ودلچسپ مضامین بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ آپ ہندی میں بھی واقفیت رکھتے ہیں اور بآسانی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ فی زمانا جو طرز تبلیغ اقوام عالم کا ہے آپ اس سے بھی باخبر ہیں۔"

ظاہر داری اور نام ونمود سے آپ کو قطعی نفرت تھی، وسعت مطالعہ کا حال مدرسۃ الواعظین کے عظیم الشان کتب خانہ کی سیر سے دریافت ہوسکتا ہے۔ بکثرت وہ

کتابیں ہیں جن پر عربی میں حواشی موجود ہیں۔ یہ علمی نوٹس جب تک کتب خانہ قائم ہے مرحوم کے باقیات الصالحات میں ہیں، ممدوح نے اپنی عمر میں جتنی قومی تحریکیں ہوئیں اُن کو کامیاب بنایا۔ محاذ حسینی اور تبرا ایجی ٹیشن میں آپ ہی کے قلم کی گردش کا اثر تھا جو اسیری کے لئے پشاور اور پنجاب اُمنڈ آیا۔ وہ منظر عام پر آنے کے عادی نہ تھے، جس مقصد کو صحیح سمجھتے تھے، اس کو مدد پہونچانے میں بلا تحریک مصروف ہو جاتے تھے۔ عشرہ اور چہلم کے دن اگر لکھنؤ میں قیام ہوا تو صرف ایک کالا کرتا پہن کر اور سروپا برہنہ کربلا تشریف لے جاتے تھے، مشاہد مقدسہ کی زیارت سے بھی خداوند عالم نے دوبارہ ۱۹۲۵ اور ۹۲۹ء میں مشرف کیا اور آپ کو علامہ بروجردی مدظلہ کی وکالت کا بھی اعزاز حاصل تھا۔

انتقال سے دو سال پہلے زیارت حرمین کا بھی شرف حاصل ہوا اور حج بیت اللہ کی زیارت ہوائی جہاز سے کی۔ اس سفر کے دلچسپ اور تاریخی حالات استقلال، لکھنؤ کی متعدد اشاعتوں میں طبع ہو چکے ہیں جو آپ کی تالیف کی حیثیت ہے۔

تقاریر ——— دنیائے شیعیت کا چپہ چپہ آپ کے مواعظ اور تقریروں سے واقف ہے، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، آگرہ، فیض آباد، اعظم گڑھ، بنارس، مرشد آباد، کلکتہ، رنگون، مراد آباد، مظفر نگر، دہلی، کاٹھیاوار، لاہور، ملتان، راولپنڈی، پشاور، مدراس، ویلور، بنگلور، مسقط، مڈغاسگر، زنجبار، کشمیر، جموں اسکردو، لداخ، تبت وغیرہ میں معرکۃ آلارا تقریریں فرمائیں، عشرت رحمانی صاحب ریڈیو اسسٹنٹ کے زمانہ میں ماہ محرم اور دیگر مواقع پر آل انڈیا ریڈیو سے بھی آپ کی تقریریں نشر ہوئی ہیں۔

اعزاز ملکی ——— مولانائے محترم کا چونکہ اُس خاندان سے تعلق تھا جس کے

مشہور ہستیاں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اس لئے سول وملٹری حکام آپ کی خاص عزت کرتے تھے، اپریل ۴۷ء میں جب آپ دہلی میں سر سلطان

بالقابہ کے مہمان تھے اور دہلی کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کیلئے تشریف لے گئے تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سابق کے رواسم کی بناء پر آپ کو اپنے یہاں دعوت دی اور اپنے تصانیف مطالعہ کے لئے دیئے۔

ہز اکسیلنسی سروجنی نائیڈو گورنر یوپی نے آپ کو کئی مرتبہ گورنمنٹ ہاؤس میں باریاب کیا۔ اور سیاست حاضرہ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی لیکن اس علم نواز گوشہ نشین نے اپنے حدود عمل سے تجاوز نہ کیا۔ پشاور کے دوران قیام میں سرحد کے گورنر مسٹر کنگھم سے کئی بار ملاقات ہوئی اور اختلاف خیال میں آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہے اور اتنی خاندانی عزتوں کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ناکافی اور قلیل مشاہرہ پر شکر منعم اور فرائض کی ادائیگی میں ولولہ ان کی خاص صفت تھی مال و دولت کی کبھی ہوس نہیں کی اور ایسے ذرائع کے قریب نہیں گئے۔

اخلاق ——— عام لوگوں کے ساتھ آپ کا خلق و مروت اس قدر قابل ذکر ہے کہ جو ایک مرتبہ آپ سے ملتا تھا اس کے دل میں آپ کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی تھی، غیر شیعہ حضرات کے ساتھ آپ کے خلق ہی کا نتیجہ تھا کہ پشاور اور مضافات پشاور کے اہل سنت بھی اتنی ہی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے، جتنا شیعوں میں مقبول تھے۔ اپنے ہمدرس افراد کے ساتھ آپ بہت ہی سادگی اور غیر معمولی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے، مدرسہ سلیمانیہ کے ہم سبق طلباء میں نواب زادہ محمد مہدی صاحب، ایم، ایل، سی، نواب علی سجاد صاحب، علی اکبر صاحب کاظمی اور مدرسہ ناظمیہ کے اہل علم و کمال میں مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ و حافظ کفایت حسین صاحب، مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ، حضرت قیس زنگی پوری کی خاص عزت کرتے تھے۔

قبول مذہب حق ——— مولانائے مرحوم کے تبلیغی کارناموں پر نظر کرنے سے وہ اسماء پیش کیے جاسکتے ہیں جنہوں نے آپ کے روبرو مذہب حق اختیار کیا۔ ضیق وقت میں ہم تفصیل سے قاصر ہیں۔ اور جارج سالون کا نام بتا کر اس

مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔ موصوف نے ۲۵؍جنوری ۱۹۳۸ء کو عیسائیت سے تائب ہو کر حقانیت اسلام کا اقرار کیا اور اسلامی نام محمد جعفر تجویز ہوا۔

(ملاحظہ ہو الواعظ، فروری ۱۹۳۸ء)

وفات حسرت آیات ——— ۷؍شوال بروز جمعہ مطابق ۱۳؍جولائی صبح کی نماز اور تعقیبات سے فراغت کے بعد سر میں درد کی شدت ہوئی۔ آرام کے لئے لیٹ گئے، ۳۰ : ۷ بجے صبح کو کمزوری قلب نے حالت مزاج میں زیادہ تغیر پیدا کر دیا۔ ۱۱ بجے شدید تپ اور غشی شروع ہوئی۔

افسوس ہے کہ یہ آفتاب علم و کمال ۸؍شوال ۱۳۷۰ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مرحوم نے پچپن سال کی عمر میں صرف ایک نوجوان صاحبزادہ سید ناصر حسین زیدی فخر الافاضل چھوڑے۔ خداوند عالم زیور صلاح و سداد سے آراستہ کرے۔

(الواعظ جولائی و اگست ۵۱ء)

سچ تو یہ ہے کہ تشیع اور تفلسف میں
کچھ قدرتی رشتہ حب ہے۔

علامہ عدیل اختر
(اصل مسودہ صفحہ ۳۲)

تصانیف علامہ عدیل اختر رح

از شیر تبلیغ جناب مولانا شیخ محمد حیدر صاحب قبلہ مرحوم واعظ

۱ـــ دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر

یہ کتاب استاد مرحوم نے مقام مجنگا مڈ غاسگر (افریقہ) سے واپس آکر بحالت قیام پشاور صوبہ سرحد ماہ جون ۱۹۲۶ء میں تالیف کی تھی، مرحوم نے شروع کتاب میں مشہور مسلم کتب حضرات اہل سنت کے نام اور ان کے مصنفین کے اسماء مع سن ولادت و وفات تحریر فرما دیئے ہیں۔ نیز سنین طباعت و مطابع کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں ان کی شہرت علمی دنیا میں عام ہے۔ دوران تحریر جن کتابوں سے حوالہ جات دیئے ہیں ان کے صفحات اور سطور بھی بعینہ نقل کر دیئے ہیں تا کہ کسی انصاف پسند حق بین اور غیر جانبدار ناظر کو تلاش ماخذ میں زحمت و وقت اور سراسیمگی و بے اطمینانی نہ ہو۔ یہ کتاب تقریباً ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں استاد مرحوم نے مختلف علوم کی روشنی میں بحث امامت و خلافت پر بے نظیر کتاب لکھی ہے۔

۲ـــ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان (مسئلہ تقیہ)

یہ کتاب موضوع تقیہ پر لکھی گئی ہے، حاشیہ پر تحریر ہے کہ اصل رسالہ ۵۲ء میں لکھا گیا۔ بزمان قیام آگرہ تبرکاً شہید ثالث کی روح سے استمداد کی غرض سے مزار مقدس کے متصل بیٹھ کر مسودہ نقل کیا جا رہا ہے لہٰذا انہیں کے نام پر معنون کیا جا رہا

ہے۔ ضمیمہ میں مصنف نے ان حضرات سے جو مذہبی مسائل میں راہ صداقت و حق کے جویا ہیں ان سے خاص طور سے اپیل کی ہے کہ میری کتاب کو بغیر کسی جانبداری کے بہ انصاف از اول تا آخر دیکھا جائے۔ انشاءاللہ پوری تسکین کا باعث ہوگی۔

۳ـــ صلۃ تاریخ احمدی

"مصنفہ جناب نواب احمد حسین خان صاحب مرحوم پریانواں" "نواب صاحب مرحوم نے تاریخ احمدی لکھ کر ایک بہت بڑا سرمایہ تاریخ قوم کے سپرد فرمایا تھا۔ جن کو ملک کے ہر گوشہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ مختلف موضوعات پر کتب اہل سنت والجماعت سے عبارتیں بجنسہ حاشیہ پر منقول ہیں مگر کتاب میں حوالے نہیں ہیں علامہ عدیل اختر نے حوالے اضافہ فرما کر کتاب کے استحکام میں بے حد کد و کاش سے کام لیا ہے اور صحیح معنوں میں تاریخ احمدی کے متعلق قوم کی اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ چنانچہ خود استاد مرحوم نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

"تاریخ احمدی مولفہ جناب شیخ احمد حسین صاحب اپنی خوبیوں کے سبب اس قدر جلد مشہور اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ مصنف کی زندگی ہی میں دوبارہ سہ بارہ چھپ کر تشنگان حقائق و طالبان واقعات واقعی کی تشنگی دور کرنے اور اصلیت پر پردہ ڈالنے والوں کی ظلمت کو کافور کرنے میں مسیحائی کا کام کر گئی..... میں نے اضافوں کو اصل کتاب میں مخلوط نہیں کیا تا کہ مصنف کی محنت نمایاں رہے.....وہ سب اضافے بطور "صلہ تاریخ احمدی" مناسب مقام کے ساتھ حوالوں کے صفحات کے ہمراہ لکھے اور

کچھ بالکل آخر میں بغرض افادہ بڑھا دیئے۔"

(عدیل اختر مدرسۃ الواعظین لکھنؤ۔۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء)

۴۔ فلسفۂ اسلام یا علم کلام

یہ کتاب معہ ضمیمہ تقریباً ۱۰۰ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ موضوع خود عنوان کتاب سے ظاہر ہے۔ کافی جد و جہد اور تلاش کے باوجود کتاب کے اول و آخر میں کہیں زمانہ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

۵۔ اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال

یہ کتاب علم رجال میں مرحوم نے نہایت سلیس اور آسان طرز پر لکھی ہے اور مختلف مقامات پر جرح و تعدیل کے طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ ماہرین و شائقین فن رجال کیلئے ایک نادر وگرانبہا سرمایۂ علمی چھوڑا ہے۔ زیر نظر کتاب کے آخر میں استاد مرحوم نے ممدوح اصحاب رسول میں بعض حضرات کے حالات معتبر کتابوں سے تحریر فرما دیئے ہیں۔ یہ کتاب ۳ رذی الحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی اور تقریباً ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۶۔ تدلیس شبلی

استاذ علام نے تاریخ یا مناظرہ میں ایسی یادگار چھوڑی ہے جس کے متعلق اکثر وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے مولانا شبلی نعمانی کی تالیف کو بخوبی دیکھ کر ایسا جواب دیا ہے کہ جس پر تمام ارباب انصاف کو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ یہ کتاب بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی بڑی گرانمایہ اور مایہ ناز تحقیق علمی کا نچوڑ ہے۔ جو مرحوم کا عصر حاضر میں طرۂ امتیاز تھا۔ یہ کتاب ۱۴ ستمبر ۱۹۴۶ء کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۷۔ علمی خیانتیں

یہ کتاب کسی فن سے متعلق نہیں بلکہ خود مستقل بالذات یہ ایک فن ہے جس پر

اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا خود مرحوم کو اپنی یہ تصنیف محبوب تھی۔ واقعاً انہوں نے اس گرانبہا اور اہم فریضہ سے دیگر علمائے اسلام کو ان کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔ مصنف نے آخر میں مقصد کتاب کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جن حضرات کے پاس اس وقت اصلی کتابیں موجود ہیں اُن کی خصوصی حفاظت کریں، جن کے پاس نہیں ہیں وہ جب حاصل کریں تو کوشش کر کے وہ نسخے حاصل کریں جو غیر محرف ہیں اور آئندہ نسلوں کے پاس یہ سند رہے کہ کتابوں میں اس طرح "علمی خیانت" کی گئی ہے"

۸۔ تسکین الفتن فی صلح الحسنؑ

امام حسن علیہ السلام کی معتبر اور مدلل تاریخ ہے، سرسری طور پر میں نے بھی اس کتاب کو دیکھا ہے اور مرحوم کے وہ الفاظ بھی اب تک کانوں میں گونجتے ہیں جبکہ یہ فرماتے تھے "امام حسن علیہ السلام کے واقعات بھی واقعہ کربلا سے کچھ کم نہیں تھے۔"

آہ! استادمرحوم

ہم آپ کے سایۂ عاطفت اور ظل حمایت سے محروم ہو گئے

از مجاہد ملت، خطیب اعظم، مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ عموماً دور کی نگاہ میں جو خوبیاں نظر آتی ہیں، قریب آ کر دیکھنے میں وہ کم یا معدوم یا اس کے برعکس دکھائی دیتی ہیں۔ اسی بنا پر مثل مشہور ہے کہ دور کے ڈھول سہانے۔ مگر استاد مرحوم حضرت علامہ عدیل اختر صاحب قبلہ مرحوم طاب ثراہ کے معاملہ میں اس کو برعکس پایا۔ جو سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔ جو مشہور تھا اس سے زیادہ پوشیدہ پایا۔ ان کے علم و فضل اور کردار کی جو شہرت تھی اس سے کون ناواقف تھا۔ پھر جبکہ مرکز علم و کمال لکھنؤ میں آٹھ سال سے مولوی صاحب مرحوم کی عمومی تربیت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تب کیونکر ناواقف رہ سکتا تھا۔ مگر مدرسۃ الواعظین میں داخل ہو کر جب استاد مرحوم کی آغوش تعلیم و تربیت میں جگہ ملی تو یقین آیا کہ کسی نے سچ کہا ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ ہم نے جو دیکھا وہ ہمارے عالم خیال سے بہت بلند تھا۔ آج جب کہ مولوی صاحب مرحوم موجود نہیں ہیں کہ ان کے خوش کرنے کے لئے کوئی کچھ لکھے۔ اس وقت اقطاع برصغیر ہند و پاکستان ملک افریقہ وغیرہ سے جو اس قومی حادثہ کے متعلق آوازیں آ رہی ہیں، میں نے ان کو بغور سنا تو تقریباً سب میں دو باتیں مشترک پائیں۔ ہر لکھنے والے نے علامہ لکھا اور ہر کہنے والے نے حق گو، راست کردار، مضبوط رویہ کا انسان کہا۔ جوہر انسانیت ان دو باتوں

کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ خلاصہ شرائع الٰہی بھی ایمان و عمل صالح ہی ہے۔ عالم دین اور نمائندہ مذہب کے واسطے یہی دو باتیں کافی ہیں خواہ لوگوں کو اس نورانی سورج کی ضیاباری کا علم ہو یا نہ ہو۔ دنیا اعراض کرے یا اقبال، لیکن اگر کوئی علم و عمل میں کامل یکتا ہے تو وہ عالم دین اور نمائندہ مذہب ہے۔ اگر استاد مرحوم میں یہ اوصاف گمنامی کے عالم میں بھی پائے جاتے تو بھی ان کی فضلیت و رفعت درجات کے واسطے کافی تھے۔ مگر اقطاع عالم سے جو خطوط و تار آئے علماء و فضلاء نے جس طرح تعزیت پیش کی، بڑی تعداد میں جو تعزیتی جلسے اور مجلسیں ہوئیں، ان سب سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم مرحوم کے کارناموں سے واقف تھی۔ آج ہر شخص کی زبان پر ہے کہ اس قومی حادثہ کی تلافی ناممکن ہے سچ ہے کب کسی مسند نشین علم کے اٹھنے کے بعد اسکی جگہ پر ہو سکتی ہے جو آج جامع ذات کے اٹھ جانے سے قومی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر ہو سکتا ہے۔

ان سطور میں استاد مرحوم کا تعارف نہیں کرانا چاہتا اور نہ یہ ممکن ہے۔ سورج کو کس کی روشنی میں دکھلایا جائے۔ بلکہ میری اس تحریر کا مقصد صرف اپنے تاثرات پیش کرنا ہے۔

تربیت و تعلیم کا انداز

پچھلے لوگوں کی حکایات کے ذیل میں سنا تھا کہ استاد کا اثر شاگرد میں ایسا ہوتا تھا کہ کامل شاگرد ہر طرح استاد کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ مگر موجودہ تعلیم میں سب سے بڑا نقص ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف استادوں سے سابقہ ہوتا ہے کہ شاگرد کسی ایک استاد کا بھی اثر قبول نہیں کر سکتا۔ چنانچہ استاد مرحوم اس طریقہ تعلیم کے مخالف تھے۔ ان کا طریقہ تھا کہ اپنے طالب علم کو زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ تین سال کے عرصہ میں ایسا بنا دیتے تھے کہ آج تک مولوی صاحب مرحوم کا ہر فارغ التحصیل شاگرد علم و عمل میں نیک نام رہا۔

استاد مرحوم نے محسوس کیا کہ زمانہ میں دہریت اور لامذہبیت کے زور نے علم دین اور اس کے حاملین و طالبین کی جس قدر بے قدری کر دی ہے اس کا اثر ہے کہ آج

کا طالب علم اپنے ماحول سے ڈرا سہا نکلتا ہے کہ مخالف و معاند سے مجوب نہ ہوجائے۔اس بے ہمتی اوراحساس کمتری نے یہ اثر ڈالا کہ فکر معاش نے علم دین کے حصول کے ذوق وشوق کوفنا کردیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کا طالب علم تعلیم وعمل میں کمزور نکلنے لگا۔خوداس کی یہ خامی احساس کمتری کا سبب تھی۔چنانچہ مولوی صاحب مرحوم سب سے پہلے نگاہ طالب علم کواتنا بلند کرتے تھے کہ مطمئن نگاہ **العلم علمان علم الادیان و علم الابدان** ہی رہے۔

تربیت کا یہ اثر ہوتا تھا کہ سفر کے صعوبات، مالی مشکلات، ناقدری کے احساسات کے باوجود بغیر کسی سہارے کے مرحوم کے طالب علم خدمت دین وتبلیغ حق کے لئے مختلف مما لک میں نکل جاتے تھے اور بامراد پلٹتے تھے۔

اس وقت بھی استاد مرحوم کے شاگردوں کی جماعت اس مذہبی و پیدائشی فریضہ کوبطور احسن انجام دے رہی ہے اوران کا شمار ملک کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔

اپنے طالب علم سے جناب مرحوم کی محبت رسمی نہ ہوتی تھی بلکہ اولاد سے زیادہ چاہتے اورخیال کرتے تھے طالب علم پر اولاد سے کم بھروسہ نہ رکھتے تھے۔مجھے خوب یاد ہے کہ جب مولوی صاحب مرحوم سفر حج سے واپسی پر کراچی اترے تھے تو آپ کے اعزاء نے خواہش کی تھی کہ ملکی فرقہ وارانہ فضا خراب ہے آپ کراچی چلے آئیں۔اس پر آپ نے جواب دیا تھا کہ ''میرے علاوہ اہل وعیال میں سب کو بلا لو مجھے کوئی عذر نہیں لیکن جب تک میرا قیام مدرسۃ الواعظین میں ہے اس وقت تک میں وہاں سے کہیں نہ جاؤں گا اور یقین دلاتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ آرام میں رہوں گا جس راحت میں تم لوگ رکھ سکتے ہو اور اگر سفر آخرت درپیش آجائے گا تو بھی اس حالت سے اچھا ہوگا جتنا اہتمام تم لوگ کر سکتے ہو'' اور استاد مرحوم نے اس قول پر حرف بہ حرف عمل کر کے دکھا دیا۔بارگاہ احدیت میں دعا ہے کہ جناب مرحوم کے شاگرد آپ کے حسب اعتماد ثابت ہوں۔

تبلیغی دورے

بعد فراغت ابتدائی دور میں تبلیغی دورے کیے۔مرشد آباد اس طرح پہنچے کہ اسٹیمر سے اترے تو بارش ہورہی تھی۔قلی نے پوچھا کہ کہاں لے چلیں؟ آپ ناواقفیت کی بناء پر خاموش تھے۔یہاں تک کہ اس غریب الوطن خادم دین کی یہ کہہ کر رہبری کی کہ فلاں سرائے میں لے چلو۔سرائے میں قیام کیا شب گذاری صبح کو دیکھا کہ رات جس کو زمین سمجھ کر سوئے تھے وہ خس وخاشاک ہے۔جسے اقتصادی بدحالی کے باعث خود ہی صاف کرنا پڑا۔اس کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔بنگال جیسے غیر مناسب حال صوبہ میں شدھی کی تحریک جب زور پر تھی تو احقاق حق واعلا مذہب حقہ کے واسطے اس عالم میں نکلے کہ صبح کے بعد شام تک زندہ رہنے کی توقع نہ تھی۔اس طرح اپنے مساعی جمیلہ سے حفاظت دین فرمائی۔

چنانچہ نجم العلماء کی دوررس نگاہوں نے آثار سے پہچان کر اس قدر اعتماد کیا کہ دور کے ممالک سے اپنا رابطہ قائم کرنے کے واسطے منتخب کیا اور رنڈ غاسکر بھیجا جہاں سے آپ کامیاب دورہ کر کے واپس آئے۔

اس طرح سرزمین برما پر مذہبی بنیاد کو قائم و مستحکم کرنے کا جب سلسلہ شروع ہوا۔تب ہی استاد مرحوم کو منتخب کر کے دارالسلطنت رنگون بھیجا گیا۔آپ کی خدمات نے یہ اثر پیدا کیا کہ وہاں سے دوبارہ آپ کو بلایا گیا اور پھر رنگون تشریف لے گئے۔

کشمیر وتبت کا سفر کیا جہاں سیلاب میں گھرے پریشانی میں پڑے مگر دین کی خدمت میں مصروف رہے۔مصروفیت اتنی بڑھی کہ پشاور میں مقیم اہل وعیال کی خبر گیری بھی نہ ہوسکی۔تکالیف کا یہ عالم تھا کہ کمبل اوڑھ کر اس کے اندر اپنی ڈائری لکھی۔

تبت وکشمیر میں آپ کا مایہ ناز کارنامہ یہ تھا کہ فرقۂ نوربخشیہ اور شیعوں کے اختلاف کی خلیج کو مٹایا جو برابر وسیع ہوتی جارہی تھی۔حالات کی بنا پر آپ کا زیادہ قیام نہ ہوسکا ورنہ شاید نوربخشی فرقہ کی شیعوں میں شمولیت ہوجاتی۔

جناب مرحوم کی ناقدانہ نظر میں فرقہ نوربخشیہ کی بنیاد عالم تقیہ میں خدمت تبلیغ

کرنے کی بنا پر پڑی کہ شیعت کو صوفیت کے لباس میں محفوظ کر کے عوام کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ بعد میں زمانہ کے حالات نے صوفیت کے پردے کو چاک نہ ہونے دیا اور نہ ہی باقی فرقہ کے شیعہ ہونے میں آپ کو شک نہ تھا۔ زیادہ دن نہیں گذرے کہ جب آپ کو اسی جذبہ خدمت دین نے مسقط جیسے بعید المسافۃ ملک میں جانے پر مجبور کیا اور کئی ماہ تک آپ وہاں مصروف خدمت رہے۔

ان طویل سفروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں حسب ضرورت و دعوت دورہ فرماتے رہے۔ چنانچہ اس سال صوبہ سوراشٹر کا دورہ کیا۔ مہوا بندر، احمد آباد، بھاؤنگر وغیرہ میں تقریریں فرمائیں۔ جن کے نقوش اب تک اپنی پوری تابناکی کے ساتھ موجود ہیں جیسا کہ وہاں سے آمدہ خطوط و تار اور مجلسوں و تعزیتی جلسوں سے معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ سال جنوبی ہند میں مدراس و بنگلور وغیرہ کا دورہ فرمایا جس کے نتیجے میں ویلور میں ایک صاحب نے مذہب اہل سنت چھوڑ کر مذہب حقہ امامیہ جعفریہ اثنا عشریہ قبول کیا۔ بنگلور میں سیرت نبویؐ پر آپ نے ایسی پر اثر تقریر فرمائی کہ محمد شریف صاحب صدر جلسہ نے جو ریاست میسور میں وزیر ہیں اپنے تاثرات کا اظہار تقریر صدارت میں کیا۔

مذہبی خدمت کا شغف

جناب نجم العلماء نے استاد مرحوم کے علمی و عملی کمالات اور دینی شغف کو دیکھ کر مدرسۃ الواعظین کی رہبری کے واسطے منتخب کیا اور پشاور سے بلا کر لکھنؤ میں رکھا۔

استاد مرحوم نے بھی اخیر وقت تک اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ آپ کے بعد جماعت مبلغین اپنے لئے راہبر کی تلاش میں ہیں مگر حیران۔

استاد مرحوم نے شدید مصائب کا مقابلہ کیا۔ اعزاء کا فراق گوارہ کیا اپنے اور بعد والوں کے مستقبل کو تاریک کیا مگر مدرسۃ الواعظین کی خدمت نہ چھوڑی تاکہ اسلام کے نورانی چہرے کو بے نقاب کر دیں۔ یہ تو سچ ہے جناب مرحوم نے اپنے

پسماندگان کے واسطے علاوہ قرض کے کچھ نہ چھوڑا۔ مگر قوم اور مذہب کے واسطے اپنی معنوی اولاد کا زبردست سرمایہ چھوڑا جو بحمد اللہ مختلف ممالک میں استاد مرحوم کی نیابت میں مذہبی فرائض انجام دے رہا ہے۔

بلند کرداری و عمل کی پختگی

مولانا مرحوم جس مضبوط کردار کے حامل تھے اس سے زیادہ عرض کرنے کا محل نہیں۔ صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں۔ زمانہ قیام پشاور میں بعض معاملات ایسے پیدا ہوئے جن میں استاد مرحوم کی آمدنی بالکل مفقود ہو گئی اور شاید مدرسہ پر اس زمانہ کی تنخواہ اب تک باقی چلی آتی تھی۔ غرض کہ آمدنی اتنی نہ تھی اور اہل و عیال کا بار تھا۔ عین اسی زمانہ میں پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعہ آپ کی خدمت میں کورم ایجنسی کے قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا۔ مگر آپ نے اس کو شرعاً جائز نہ خیال کرتے ہوئے رد فرمایا حالانکہ وہ وقت شدید مالی دقتوں کا تھا۔

اپنے کردار سے مدرسۃ الواعظین کو جو عظیم الشان فوائد پہنچائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ قومی اختلافات بہ کثرت رونما ہو گئے تھے، خصوصاً مذہبی اور سیاسی و مقامی اختلافات نہایت شدت اختیار کر گئے تھے۔ مگر آپ غیر جانبدار پالیسی اختیار کر کے اس پر شدت سے قائم رہے کہ آج بہت سی ہستیاں اختلافی بن چکی ہیں۔ مگر مدرسۃ الواعظین کی قوم میں وہی حیثیت ہے جو ۱۹۱۹ء میں قیام مدرسہ کے وقت تھی۔

اس طرح جب آپ کا قیام پشاور میں تھا تو کسی مذہبی معاملہ پر حکومت اور شیعوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ گورنر سرحد نے عمائدین قوم کو بلایا۔ یہ سنگینوں کا دور تھا اور پشاور کی سرزمین جہاں سوائے قتل کے کوئی سزا نہ تھی۔ آپ بحیثیت شیعہ عالم پیش ہوئے۔ حکومت اپنے اثرات سے معاملہ کو دبانا چاہتی تھی۔ قبل اس کے کہ گفتگو شروع ہو آپ نے کھڑے ہو کر قوم کے مطالبہ کو پیش کیا اور اس کے نامنظور ہونے اور شیعوں کی جانبازی کا ذکر کر کے اس سے پہلے محفل سے چل کھڑے ہوئے کہ گفتگو بڑھے اور ردو قدح ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ برخاست ہو گیا اور معاملہ حسب منشا قوم طے ہو گیا۔

ایجی ٹیشن میں خدمات

جب لکھنؤ کی فضا تحریک مدح صحابہ کے زہر سے مسموم تھی اور اس کی امداد کے واسطے اہل شہر وعلماء جناب ناصر الملۃ کے مکان پر جمع تھے مومنین طالب تھے کہ ہم کو اذن مل جائے تو ایجی ٹیشن شروع کر دیں۔ جناب ناصر الملۃ اور نجم العلماء اپنے اجتہادی فکر کی بناء پر خاموش تھے۔ آپ نے یہ کہہ کر فیصلہ کے قریب کر دیا، اذن کیوں چاہتے ہو؟ منع بھی نہیں کر رہے ہیں تم نے اطلاع کر دی اب جا کر شروع کرو۔ اگر ان کو منع کرنا ہوگا تو منع کر دیں گے۔ تم رک جانا۔ غرض کہ دوسرے دن محاذ حسینی شروع ہوگا۔

فریق مخالف نے ممبران کونسل و اسمبلی میں یہ پروپیگنڈہ کر دیا کہ کسی فریق کو کیا حق ہے کہ وہ دوسرے مذہب کے رہبر کے متعلق اس کے ماننے والوں کو اس کی مدح وثنا نہ کرنے دیں۔ یہ ایسا کلمۂ حق تھا جس سے اس طرح ارادہ باطل ہوگیا کہ شیعوں کے خلاف رائے عامہ پیدا ہوگئی۔ چنانچہ استاد مرحوم نے انگریزی میں ''تبرا اینڈ مدح صحابہ'' ایک مختصر رسالہ لکھا اور طالب علموں سے پریس کا کام لے کر رات ہی کو چھپوایا۔ دوسرے دن ہر ممبر کے ہاتھ میں اس کی ایک کاپی تھی اور حامیان مدح صحابہ کا قصر تزویر منہدم ہو چکا تھا۔ آپ کی تحریروں اور تقریروں سے عاجز آ کر حکومت نے گرفتار کرنا چاہا مگر جناب رئیس الحفاظ علامہ حافظ کفایت حسین صاحب دام ظلہٗ جیل جانا چاہتے تھے۔ اور آپ کے جانے کے بعد صوبہ سرحد و پنجاب کے مجاہدین میں انتشار ہو جاتا لہٰذا آپ روپوش ہو گئے اور پشاور پہنچ کر اعانت محاذ فرماتے رہے۔

اصابت رائے

مولوی صاحب مرحوم صاحب تقویٰ وورع عالم دین ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کا لباس تدبر بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب شریعت کانفرنس منعقد ہوئی تو باوجود اس کے کہ اس کے داعی اور شرکاء سب حضرات اہل سنت تھے مگر آپ کو اس کا نائب صدر چنا گیا اور جمیعۃ علماء ہند کو یہ بات یاد تھی یہاں تک کہ جب دو سال پہلے لکھنؤ میں

جمیعۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ہوا اور شیعہ علماء کی شرکت کے خواہش مند ہوئے تو دعوت میں شرکت کی دلیل مولوی صاحب مرحوم شریعت کانفرنس کی شرکت کو پیش کیا۔ چنانچہ مجلس علماء شیعہ کے نمائندے جناب خان بہادر مولوی مہدی حسن صاحب نے شرکت بھی فرمائی۔

گذشتہ سال حکومت ہند نے ایشیائی ممالک سے تمدنی وثقافتی تعلقات قائم کر لئے، ایک ادارہ کھولا تو اس میں بحیثیت نمائندہ مدرسۃ الواعظین مولوی صاحب مرحوم کو دعوت دی گئی اور آپ دہلی تشریف لے گئے۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ جب مولوی حفظ الرحمن صاحب کو معلوم ہوا کہ آپ گلزار ہوٹل بلیماران میں مقیم ہیں تو فوراً اپنا مہمان کیا اور اتنا مجبور کیا کہ ہوٹل سے اٹھ کر جمیعۃ کے دفتر میں قیام کرنا پڑا۔ دوران قیام ہر طرح کی مہمان داری ہوتی رہی اور اجلاس میں بھی ساتھ ساتھ شرکت ہوئی۔

لیکن سیاست کو غیر مستقل دیکھتے ہوئے اپنی نہ بدلنے والی طبیعت کی بنا پر کنارہ کشی کر لی پھر بھی نجی طور پر جو باتیں آپ کہہ جاتے تھے تجربہ شاہد ہے وہ پوری اترتی تھیں۔

اسی طرح جب ہندی کو قومی زبان بنانے کی تحریک شروع ہوئی تو آپ نے فرمایا تھا کہ عملاً ہندی سرکاری زبان کا کام نہ دے سکے گی۔ جذبات جتنے دنوں تک اس کو زندہ رکھ سکیں اسکی اتنی ہی مدت حیات ہے چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ فی الحال حکومت نے ہندی کو سرکاری زبان بنا کر دس سال کے واسطے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے دیا ہے مگر اس مدت کے بعد بھی ہندی کے برسر کار ہونے کی امید نہیں ہے۔

چھ ماہ ہوئے ہوں گے جب وزیر داخلہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ زبان کے معاملہ میں از سر نو سوچنا ہوگا۔

مضمون مختصر ہونے کے باوجود طویل ہوگیا۔ ابھی بہت کچھ قلب ودماغ میں محفوظ ہے جس کے لئے سوانح عمری کے صفحات موزوں ہوں گے جس کے اہتمام کی خدا سے دعا ہے اور استاد مرحوم کے تلامذہ ومعاصرین واعزا سے امداد کا طالب ہوں۔

اشکبار سید غلام عسکری

فلسفۂ اسلام یا علم کلام

ازاستاذ الاساتذہ فیلسوف عصر حجۃ الاسلام والمسلمین
مولانا سید محمد شاکر نقوی صاحب قبلہ دام ظلہ العالی

یہ مسئلہ کب سے تشنۂ تفصیل تھا کہ علم کلام کی بحث کیا ہے اور اس کے وجود کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اس موضوع پر اہل علم وقلم نے اپنی اپنی فکر آزمائی فرمائی ہے۔ سرکار علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ نے دل کی اس تمنا کو جس طرح پورا فرمایا اُسے تسکین روح کہنا صحیح ہوگا۔ قابل مبارکباد ہیں اس سلسلے میں حجۃ الاسلام مولانا سید میثم زیدی صاحب جن کا ہم جس قدر بھی احسان مانیں کم ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں جبکہ تحریر کا چھپے بے ضرورت حد تک عام ہوگیا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ وہ ذخائر جن کی ضرورت اپنے دین، اپنے مذہب، اپنے اخلاقی دنیا کیلئے واجبی ہونا چاہئے تھا وہ بکھر رہے ہیں اور بے مصرف اور ضائع ہو رہے ہیں۔ میں اپنی نالائقی کے لئے اب اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ایک احسان اور عظیم احسان مذہب پر، قوم پر، علمی دنیا پر مولانا میثم زیدی سلمہٗ کا ہے کہ ان دبے ہوئے جواہر پاروں کو منظر عام پر لاکر ہم کو اس چھپی ہوئی نعمت سے شرفیاب فرما رہے ہیں۔

خداوند عالم توفیقات کو باقی رکھے تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ سرکار طاب ثراہ سے فیضیاب ہوسکیں۔

ادنیٰ خادم سرکار طاب ثراہ
سید محمد شاکر نقوی
۲۹ صفر المظفر ۱۴۳۲ھ

بسمہ سبحانہ

جب اگلوں کے علمی خزانے لٹ لٹا کر جل بھکر پچھلوں تک پہونچتے ہیں تو پانے والوں میں جتنی لیاقت وصلاحیت ہوتی اتنی ہی استحفاظ وارتقا کے سامان مہیا ہوتے اور ان میں نئی بلندی اور زیب وزینت محسوس ہونے لگتی ہے اور اسطرح متاخرین کے تمدن وثقافت (کلچر) کی تعمیر میں متقدمین کی دولت وقوت بھی بلاشبہ شریک وسہیم ہوتی ہے۔ علی الخصوص صحیح حقائق اور واقعی علوم ومعارف تو چونکہ ابتدا سے ہی صحیح اور مطابق واقع ہوتے ہیں ان میں سے جہاں تک اگلوں کی رسائی ہوجاتی ہے وہ پچھلوں کے لئے بعینہٖ اصل سرمایہ ہوتے ہیں اور ان سے نفع حاصل کرنا ہی متاخرین کی خوش نصیبی ہوتی ہے۔

علامہ عدیل اختر ؒ

فلسفۂ اسلام یا علم کلام

تحقیق وتصنیف

فیلسوف اسلام علامہ سید عدیل اختر زیدی اعلیٰ اللہ مقامہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فلسفہ کی تعریف

لفظ فلسفہ یونانی الفاظ فیلا اور سوفا سے بنا ہے جس کے معنی عقل کا دوست یا اللہ کا دوست ہے۔ اور عربی میں حکمت اور حکیم اسی مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح عام طور سے استعمال کی جاتی ہے لیکن مصنفین اور زبانوں کے اختلاف کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنوں میں کافی اختلاف موجود ملتا ہے۔

اصطلاحی علوم فلسفیہ کی ابتدا جناب ادریسؑ پیغمبر سے کہی جاتی ہے۔ اور بعض لوگ اس طرح قرار دیتے ہیں کہ جناب لقمان سے ان کے شاگرد کو پہونچے اور وہاں سے سقراط کو، سقراط سے اس کے شاگرد افلاطون کو، پھر افلاطون سے اس کے شاگرد سکندر کو۔ اس طرح مختلف جگہوں اور شخصوں کو ملتے رہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فلسفہ کی تعریف کا پتہ ابتدا ابتدا میں افلاطون سے چلتا ہے۔ جس نے فلسفی کی تعریف یہ کی ہے کہ جو چیزوں کی اصلیت اور واقعیت کو سمجھ لیتا ہے۔ بخلاف غیر فلسفی کے جو صرف ظاہری باتوں اور دکھاووں میں الجھ کے رہ جاتا ہے۔

اب تک فلسفہ کی جو تعریف نقل ہوتی چلی آئی ہے اسی مطلب کو ادا کرتی ہے۔ البتہ عملی پہلو کی تشریح سے افلاطون کا یہ بیان خالی نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری جگہ اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہو یا اس اجمال میں قابل عمل واقعیت کا سمجھ لینا بھی شامل سمجھا جائے۔

فلسفہ کی جو تعریف اس زمانہ میں عموماً کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ "وہ علم جس میں چیزوں کی واقعی حقیقت سے بقدر طاقت بشریہ بحث کی جائے تاکہ اس زندگانی میں کمالات کا شرف اور مرنے کے بعد نجات اور سعادت ابدی کی کامیابی نصیب ہو سکے۔"

فلسفہ کی تقسیم

اس طرح فلسفہ جسے حکمت بھی کہا جاتا ہے ایک ایسا سرچشمہ ہے جس سے تمام علوم کی ندیاں بہہ نکلتی ہیں کیونکہ وہ اشیاء موجودہ جن کی نفس الامری حالت کا جاننا فلسفہ ہے وہ یا تو ایسے اعمال و افعال ہوں گے جس کا وجود ہمارے اختیار و قدرت سے ہوگا یا ایسے ہوں گے جن کا وجود ہمارے اختیار و قدرت سے نہ ہوگا۔ پہلی قسم کی چیزوں کے احوال کا علم جو اصلاح معاش و معاد کا کام دے وہ فلسفہ کی عملی شاخ ہے۔ اور دوسری قسم کے احوال کا علم علمی یا محض نظری ہے جس سے قوت عقل و نظر کی تکمیل ہوتی ہے۔

پھر ان دونوں قسموں کی تین تین قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) اگر ایسا علم ہے جو ایک شخص کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یعنی اس کو فضائل سے آراستہ اور رذائل سے پاک کرنے کے کام آتا ہے تو اسے علم تہذیب اخلاق کہتے ہیں۔

(۲) اور اگر صرف ایک سے نہیں بلکہ ایسی جماعت کے مصالح سے متعلق ہے جو ایک گھر میں رہتے سہتے ہیں مثلاً باپ بیٹا، عزیز و قریب، مالک مملوک تو اسے علم تدبیر منزل کہتے ہیں

(۳) اور اگر اس سے بھی بڑھکر ایسی جماعت کے مصالح سے متعلق ہے جو کسی شہر یا ملک میں رہتے یا کسی ایک مذہب و ملت میں شریک ہیں تو اس کو سیاست

مدن یا علم ناموس کہتے ہیں۔

اسی طرح فلسفہ نظریہ کی بھی تین قسمیں ہیں

(۱) اگر ان چیزوں کے احوال کا علم ہے جو وجود خارجی اور ذہنی دونوں میں مادہ سے مستغنی اور بے نیاز ہیں تو اس کو علم الٰہی کہتے ہیں

(۲) اور اگر ایسی چیزوں کے احوال کا علم ہے جو وجود خارجی میں تو مادہ کے محتاج ہیں لیکن وجود ذہنی میں ان کو کسی مادہ کی احتیاج نہیں مثلاً کرہ، دائرہ، مثلث، ربع اعداد وغیرہ تو اس کو علم ریاضی یا تعلیمی کہتے ہیں۔

(۳) اور اگر ایسے موجودات کا علم ہے جو ذہن و خارج دونوں میں مادہ کے محتاج ہیں تو یہ علم طبیعی کہلاتا ہے۔

طرح ظاہر ہے جملہ علوم خواہ وہ کسی سے متعلق ہوں، فلسفہ کی کسی نہ کسی قسم میں داخل ہیں۔ لیکن زمانہ اور اشخاص کے تغیر مذاق و ضروریات کے اعتبار سے کبھی کسی علم کو اور کبھی کسی فن کو اہمیت اور فروغ ہو جاتا ہے۔

علوم کی حالت بھی دوسرے تمدنی اسباب کی طرح ہے شروع شروع میں ایک ہی نام کے ذیل میں بہت سے علوم و فنون اجمالاً بیان کر دیئے جاتے ہیں اور بعض کی طرف تو تنبیہ بھی ضروری نہیں سمجھی جاتی اور اجمال ہی پر اکتفا کر لی جاتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اجزا میں تفصیل اور تجزیہ ہوتا جاتا ہے۔ شاخوں میں شاخیں، ڈالیوں میں ٹہنیاں نکلتی جاتی ہیں اور قانون ارتقا کارفرما رہتا ہے۔ یہی حال فلسفہ کا بھی ہے چنانچہ فلسفہ کے افلاطونی بیان میں منطق، اخلاق، طب، نفسیات، نظریات علمیہ اور ماوراء الطبیعیات آپس میں گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ لیکن ارسطو کے بیانات میں منطق، نفسیات، اخلاقیات نمایاں طور سے جدا جدا اور ممتاز علم معلوم ہوتے ہیں۔ باوجود اس کے جب سیاسیات اور اخلاقیات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افلاطون ہی نہیں بلکہ ارسطو کے بیان میں بھی یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے کے ساتھ غیر ممکن التحلیل طریقے سے مخلوط ہیں۔

فلسفہ کی تعریف بعض لوگوں نے ان مختصر الفاظ میں بھی کی ہے کہ

"علم الاشیاء بمبادئها و عللها الاولی"

جن پر ان کا اور ان کے مبادی اور اولین علتوں کا علم، خلاصہ یہ کہ موجودات کی ماہیت ان کے حالات، ان کے خواص و عوارض، اسباب اور علل کو واقعی حیثیت سے جاننے اور اس پر استدلال و بحث کرنے کا نام فلسفہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان نام ہے دو چیزوں کا ایک روح اور دوسرا جسم اور ظاہر ہے کہ ایک با فہم انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے لئے جو زیب و زین ممکن ہو مہیا کرے۔ صحیح فلسفہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو مکمل اور آراستہ کر دے۔ چنانچہ حکمت نظریہ انسان کی روحانی یا عقلی تکمیل کی کفیل ہے اور حکمت عملیہ انسان کے جسمانی اعمال و اخلاق کی تہذیب و تزئین کی ذمہ دار ہے۔ اور جب اسطرح ایک انسان اپنے دونوں جنبوں میں مکمل و مزین ہوگا تو اس کی معاش دنیوی بھی بے داغ ہوگی اور معاد یا اخروی زندگی بھی بارفاہ و فراغ۔ حکما نے اسی کو اجمالاً کبھی **التشبیہ بالالٰہ** سے بھی تعبیر کیا ہے۔ البتہ چونکہ انسان سے غلطی ممکن ہے کسی مسئلہ میں نفس الامری تک رسائی نہ ہونا اور غلط رائے قائم کر لینا ناممکن نہیں ہے اور اس بنا پر اگر کسی رائے میں کسی ایسے انسان کا نظریہ مل جائے جو غلطی کے امکان سے منزہ ہے تو اس کی رائے کو مقدم کرنا بھی عقل ہی کا حکم ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا فلسفہ تمام علوم کو مشتمل ہے مگر ایک زمانہ تھا جب فلسفہ سے مقصد صرف الٰہیات رہ گئے تھے اور بڑے بڑے صاحبان عقل و نظر صرف انہیں علوم سے شغف رکھتے تھے جن کا تعلق مادیات سے بالکل نہ تھا یعنی علم الٰہی یا فلسفہ اولی بلکہ بعض تو مادیات سے متعلق علوم میں دخل دینا ہی ایک قسم کی توہین سمجھتے تھے یہاں تک کہ فلسفہ کی کتاب لکھنے کے باوجود علوم طبیعہ کا ذکر تک نہ کرتے تھے۔ لیکن اب جو زمانہ بدلا تو تختہ ہی الٹ گیا کہ اس زمانہ کے فلسفیوں کا آشیانہ فلسفہ کی صرف

اس شاخ پر ہے۔جس کا دارومدار مادیات ہیں اور اسی کو علی العموم سائنس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔صرف چند علم دوست اور مشکل پسند مفکر ایسے نکلتے ہیں جو فلسفہ کے ماوراء الطبیعیات خشک مضمون کی تحقیق و تفتیش میں اپنا سر کھپائیں اور سچ پوچھو تو فلسفہ کا یہی حصہ فلسفہ کے نام سے رہ گیا ہے۔اور دوسرے حصے اپنے اپنے علیحدہ علیحدہ ناموں سے اپنی علیحدہ حکومت قائم کیے ہوئے ہیں اور ان کے ماہرین کو گویا فلسفہ سے کوئی ربط ہی نہیں۔طبیب کو کوئی فلسفی نہیں کہہ سکتا، مہندس (یا انجینئر) کو فلسفی کے نام سے نہیں پکارا جاتا۔عالم ہیئۃ کو فلسفی نہیں کہا جاتا حالانکہ یہ علوم عام فلسفہ کی خاص فرد ہیں اور بہت قریبی شاخیں ہیں۔اور ایک کو دوسرے سے بے تعلق رکھا جاسکنا بسا اوقات بہت دشوار معلوم ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔حُنین کا قول ہے کہ

"طبیب کا فلسفی ہونا واجب ہے"

فلسفہ کے نظریات اور اس پر بحث و نظر کرنے والوں کو تاریخ زمانہ قدیم سے مبتلائے کشمکش بتلاتی ہے اثینا (ایتھنز) کی تباہی کے بعد جب سقراط نے ترقی کی اور فلسفہ طبیعیہ کے اشتغال کو اس وقت کے لئے غیر مفید سمجھ کر فلسفہ عملیہ میں کدشروع کی اور تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، اور سیاست مدن کی تقسیم بیان کی، ان میں سے ہر ایک کے فرائض بتلائے، نفس کے دوام کا خیال ظاہر کیا وغیرہ وغیرہ اور اسی بناپر یونانیوں نے اسے فلسفہ ادبیہ یعنی عملیہ کا موجد بھی مانا۔یا یوں کہا جائے کہ سقراط نے فلسفہ قدیم کو خیال کی فضا سے نکال کر عمل کے میدان میں لاکھڑا کیا اور بقول شیشرون

"سقراط نے فلسفہ کو آسمان سے اتار کر زمین پر لا بسایا"

تو ان تمام خدمات کا یہ صلہ ملا کہ چونکہ سقراط کی تعلیم فلسفی اور ایتھنز والوں کے عقائد کے خلاف پڑی سقراط کو جام زہر نوش کرنا پڑا۔

یونان اور روم میں فلسفہ

فلسفہ کا رواج یونان اور روم میں جناب عیسےٰ علیہ السلام کے پہلے سے تھا لیکن جب رومیوں نے نصرانیت اختیار کی تو فلسفہ کو ممنوع قرار دیدیا یہاں تک کہ فلسفہ کی کتابیں جلا ڈالی گئیں کیونکہ شریعت عیسوی اور فلسفہ میں تضاد سمجھا گیا۔اس کے بعد پھر ایک زمانہ آیا کہ روم میں جولیانوس کے ذریعہ فلاسفہ کا مذہب رائج ہوا لیکن جب جنگ فارس میں 'جولیانوس' مارا گیا تو پھر فلسفہ ممنوع اور نصرانیت اپنے حال پر بحال ہوگئی۔

اصل یہ ہے کہ علوم عقلیہ جو انسانی طبیعت میں مرکوز ہیں جن کو ہم حکمۃ و فلسفہ کہتے ہیں وہ کسی خاص قوم و ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔فطرت فطرت ہے جو سب میں مشترک ہے البتہ قدیم زمانہ میں فارس اور روم کے تمدن کا بازار گرم تھا، وہاں ان علوم کا سکہ بھی خوب چل رہا تھا۔اسلام کے ظہور سے پہلے دولت وحکومت کے مالک یہی دو گروہ نمایاں تھے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب سکندر نے دارا کو قتل کیا اس وقت سے علوم عقلیہ فارس سے یونانیوں کو پہونچ گئے۔اس طرح فلسفہ متمدن قوموں میں گردش کرتا رہا۔اور کبھی جائز اور کبھی ناجائز ہوتا رہا۔جب ناقدری بلکہ ناعقلی و تعصب کا زور بڑھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ فلسفی موت کے گھاٹ اتارے گئے اور کتابیں نذر آتش کی گئیں۔لیکن جن لوگوں کو قدر تھی ان کا یہ انداز رہا کہ اس کو گوہر گراں مایہ سمجھتے رہے اور کسی نااہل کے ہتھے نہ چڑھ جائے اس لئے اتنی احتیاط کرتے تھے کہ جب تک کسی کا زائچۂ ولادت دیکھ کر اس کو اہل نہ پاتے

اس کو اس علم کی ہوا بھی نہ لگنے دیتے۔

ظاہر ہے کہ جن علوم وفنون کی بنیاد متقدمین کے زمانہ میں پڑتی ہے وہ بعد والوں کو بطور میراث یا عطیہ تاریخی ملتی ہے اور بقدر ذوق وصلاحیت ان میں بلندی ہوتی جاتی ہے اور جب تمدن وحکومت میں ضعف پیدا ہوتا ہے تو ہوائے نکبت وصرصر فلاکت سے عملی عمارت بھی متزلزل ہوجاتی ہے۔ اس طرح جب اگلوں کے علمی خزانے لٹ لٹا کر جل بجھکر پچھلوں تک پہونچتے ہیں تو پانے والوں میں جتنی لیاقت و صلاحیت ہوتی اتنی ہی انحطاط وارتقا کے سامان مہیا ہوتے اور ان میں نئی بلندی او رزیب وزینت محسوس ہونے لگتی ہے اور اسطرح متاخرین کے تمدن وثقافت (کلچر) کی تعمیر میں متقدمین کی دولت وقوت بھی بلاشبہ شریک وسہیم ہوتی ہے۔ علی الخصوص صحیح حقائق اور واقعی علوم ومعارف تو چونکہ ابتدا سے ہی صحیح اور مطابق واقع ہوتے ہیں ان میں سے جہاں تک اگلوں کی رسائی ہوجاتی ہے وہ پچھلوں کے لئے بعینہ اصل سرمایہ ہوتے ہیں اور ان سے نفع حاصل کرنا ہی متاخرین کی خوش نصیبی ہوتی ہے۔

ظہور اسلام سے قبل عرب کا جو حال تھا اس سے فلسفہ کی صرف بعض شاخوں کو ربط تھا مثلاً نجوم، طب، ہیئۃ، بیطاری، علم انوار وقیاسات فضاء وغیرہ۔ لیکن فلسفہ بمعنی استدلال عقلی اور بحث ونظر، جوہر وعرض، وجود وعدم یا فلسفہ اخلاق وغیرہ کی بحثیں ان سے بالکل مناسب نہ تھیں۔ جب سرزمین تہامہ پر آفتاب اسلام کا طلوع ہوا تو کچھ دن تو صرف اس کشمکش میں گزرے کہ عالم عرب اس نئے عقیدے اور اس رسول اور اس کی لائی ہوئی کتاب کی تعلیم کو مانیں نہ مانیں کیا کریں۔ عرب کے ضدی اور متعصب ماحول اور گہری جہالت کے دور دورے میں ان عقلی اور مطابق واقع باتوں کی طرف تک دھیان دینے والے دل ودماغ کی نایابی ہوگئی تھی جو بطور بدیہی خوش اخلاقی کے بیان کی جاتی تھی اس لئے رسول اسلام کو "**کلموا الناس علی قدر عقولهم**" کے زرین اصول کی بنا پر فلسفی مسائل اور الٰہیات کو ادبی انداز او رتحریص و

تہدید کے لباس میں بیان کرنا پڑتا تھا۔ کبھی قصص وحکایات کے پردہ میں، کبھی انبیا علیہم السلام کے اقوال ونصائح کو نقل کرکے حقائق کی تعلیم دینا پڑتی تھی۔ معلوم کا بغیر علۃ کے ہونا، یا اثر کے ہوتے ہوئے موثر کا انکار بجائے منطقی شکل کی کھری ترتیب کے "**اشک فی اللہ فاطر السموات والارض**" کے ذریعہ ذہن نشین کرنے کی سعی کی جاتی تھی۔

جو لوگ اس حلقہ میں داخل ہوتے تھے وہ مختلف خیال اور مختلف اغراض و دماغ کے لوگ تھے ان کو اب اپنے پرانے عقیدے اور عمل میں تغیر دینا تھا یا جو اس نئے عقیدے سے ملتے جلتے تھے یا جن سے تصادم نہ ہوتا تھا ان کی طرف کچھ توجہ قائم رکھ سکتے تھے۔ ورنہ انہیں صرف تعلیمات قرآن وپیغمبر کے یاد کرنے، روایت کرنے اور ان پر عمل کرنے سے مطلب تھا اور سچ پوچھو تو موجودات کی نفس الامری حالت بھی وہی جس کی تعلیم قرآن ورسول دے رہے تھے البتہ ان کے اظہار وبیان میں فلسفیانہ کھرا پن نہ تھا۔ بلکہ دل آویز ولآویز حکمۃ وموعظہ کے لباس میں تعلیم دی جاتی تھی۔ دیگر جملہ علوم وفنون عامہ ناس کی نظروں سے اوجھل اور بے توجہی کے عالم میں پڑے رہے۔ ہاں فقط وہ چند خالص علمی ذوق رکھنے والے اور غیر متزلزل اخلاقی قوت کے مالک جن کی اکا دکا مثالیں ہر قوم ومذہب میں اور ہر عہد وملک میں ملتی ہیں۔ شروع ہی سے علمی مشاغل میں مصروف رہے لیکن پھر بھی ان کی تعلیم کتابی صورت یا فنی تمیز وتشریح کی شکل میں رائج نہ ہوئی۔ اولاً تو اس زمانہ میں عرب میں کتابت عام نہ تھی۔ ثانیاً صحیح مخاطب صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ ثالثاً ان کا مقصود واقعی باتوں کی طرف لوگوں کو جذب کرنا تھا لہذا ان کے بھڑک اٹھنے والے خیالات میں تموج پیدا نہ ہوجانے کی تدبیر بھی ملحوظ رہتی تھی۔ لہذا وہ تعلیمات وحقائق وخطبات کی شکل میں اور کبھی کسی متجسس یا متجسس کے سوال کے جواب کی صورت میں سامعین نے زبانی یاد کرلی۔

نہج البلاغہ میں فلسفہ

''نہج البلاغہ'' کے خطبات، کلمات اور خطوط پر نظر ڈالی جائے تو نہایت آسانی سے اور اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ باب مدینہ علم علی بن ابیطالب علیہ السلام نے کیسے کیسے فلسفی مسائل کو کس خوبی سے سمجھا دیا ہے اور کھرے فلسفی مقدمات کی ترتیب کی شکل نہیں قائم فرمائی۔

فلسفی تصنیفات میں جو مختصر رسالے موجود ہیں ان کو تو علم فلسفہ کا رسالہ کہا جاتا ہے اور ان بیانات کا نام خطبہ ہے۔ مدینہ علم و حکمت کا یہ دروازہ، خاتم النبیین کا یہ شاگرد رشید، اشرف المرسلین کا یہ ابن عم اور داماد اور اس کی اولادیں اگرچہ دنیاوی حکومت و اقتدار نہ پانے کے سبب عوام الناس کی نظروں میں نہ سمائیں لیکن ان کے کلمات، دعائیں، روزانہ کی گفتگو، منبروں کے خطبے، میدان جنگ کی رجز، مواعظ و نصائح، فلسفہ اور سائنس کے حیرت انگیز مسائل پر مشتمل ہیں اور ان سے بلا واسطہ اور بواسطہ تعلیم پانے والے علوم فلسفہ و عقلیات کے بڑے بڑے صاحبان علم و مہارت پیدا ہوئے اور اس طرح علمی ذوق والوں نے ان کو کچھ نہ کچھ پہچانا بھی لیکن ظاہر ہے کہ جو انکا حق تھا وہ ادا نہ ہوا۔

صحیفہ کاملہ اور فلسفی امور

''صحیفہ کاملہ'' جو علی بن ابیطالب کے پوتے علی بن الحسین کی (جنکا انتقال ۹۵ھ میں ہوا) دعاؤں کا مجموعہ ہے اس میں ''تسمع و تری ماتحت الثری سہ موجود ہے جس سے زمین کے اندر آواز رکھنے والوں کی آبادی کا پتہ معلوم ہوتا ہے۔'' **سبحانک تعلم وزن الظلمۃ والنور**'' موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روشنی میں وزن ہے اور تاریکی میں بھی وزن ہے۔ چنانچہ روشنی کے وزن کی تحقیق زمانہ حال میں ہوئی ہے۔ ''**سبحانک تعلم وزن الریح کم من مثقال ذرۃ**'' موجود ہے جس سے واضح ہے کہ ہوائیں وزن رکھتی ہیں اور وہ تولی جاسکتی ہیں۔

منابر الاسلام جلد ۲ صفحہ ۸۳ مطبوعہ دبستان مرتضوی لکھنؤ ۱۲۸۳ھ نمبر ۳۹ پر صاحب کافی سے (جو تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں تھے) علی بن ابیطالب کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے جو طبی تحقیقات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

" قال ابو جعفرؑ ضرب رجل رجلا فی هامته علی عهد امیر المومنین فادعی المضروب انه لا یبصر بعینه شیًا و انه لایشم رائحة و انه قد خرس فلا ینطق فقال امیر المومنینؑ ان کان صادقا فقد وجبت له ثلث دیات النفس فقیل له و کیف نستبرء ذلک منه یاامیر المومنین حتی تعلم انه صادق فقال اما ادعائه فی عینیه انه لایبصر بهما

فانه يستبرء ذلک بمقابلة الشمس بان يقال له ارفع عيناک الی عين الشمس فان کان صحيحا لم يتمالک الا ان يغمض عينيه و ان کان صادقا لم يبصر بهما بقيت عيناه مفتوحتين. و اما ادعائه فی خياشميه و انه لايشم رائحة فانه يستبرء ذلک بحراق يدفی من انفه فان کان صحيحا و صلت رائحة الدخان الی دماغه و دمعت عيناه و تنحی راسه و اماما ادعائه من الخرس و انه لاينطق فانه يستبرء ذلک بابره تضرب علی لسانه فان کان ينطق خرج الدم احمر و ان کان لاينطق طرح الدم اسود"

"حضرت ابو جعفرؑ نے فرمایا کہ "ایک شخص نے امیر المومنین کے عہد میں ایک شخص کے سر پر مارا، جس کے مارا تھا اس نے دعویٰ کیا کہ اب وہ نہ آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، نہ کوئی بو اسے محسوس ہوتی ہے اور گونگا بھی ہوگیا ہے بول نہیں سکتا۔ امیر المومنین نے فرمایا کہ اگر وہ سچ کہتا ہے تو اس کو ثلث دیۂ نفس ملنا چاہیے۔ لوگوں نے عرض کی کہ یا امیر المومنین ہم اس کو آزمائیں کیونکر آپ نے فرمایا کہ اس نے جو آنکھ سے نہ دیکھ سکنے کا دعویٰ کیا ہے اس کا امتحان تو آفتاب کے سامنا کرانے سے ہوسکتا ہے۔ اس کو کہا جائے کہ اپنی آنکھیں ٹھیک آفتاب کے سامنے کرے۔ اگر وہ درست ہوں گی تو وہ بے ساختہ فوراً آنکھیں بند کرلے گا، کھلی نہیں رکھ سکتا۔ اور اگر سچ کہتا ہے کہ نہیں دیکھ سکتا تو اسکی آنکھیں کھلی رہیں گی۔ اب رہا اس کا دعویٰ ناک کے متعلق کہ بو نہیں آتی تو اس کی ترکیب یہ ہے کہ اس کی ناک کے پاس حراق جلائیں اگر صحیح ہوگا تو دھوئیں کی بو اس کے دماغ تک پہونچے گی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے اور اپنا سر کھینچ لے گا۔ اب رہا اس کا دعویٰ گونگا ہوجانے کے متعلق تو اس کا امتحان یوں ہوسکتا ہے کہ اس کی زبان میں سوئی چبھوئی جائے اگر بول سکتا ہوگا تو خون سرخ نکلے گا اور گر نہ بول سکتا ہوگا تو خون سیاہ نکلے گا۔"

اس طرح بحار الانوار، احتجاج وغیرہ کی روایتوں میں جو معجزات مذکور ہیں ان میں فلسفہ، طب، نجوم وغیرہ کے مسائل کا کافی تذکرہ موجود ہے۔ البتہ ان کا بیان اس انداز سے نہیں ہے جیسے کھرے فلسفہ کی تصنیف۔

مختصر یہ کہ فلسفہ اس ابتدائی دور میں کتابی شکل میں رائج نہ ہوا اور دوسرے علوم ہی کب کتابی صورت میں تھے جو اس وقت فلسفہ کی تصنیف کی تلاش کی جائے اور جب مسلمانوں نے فارس فتح کیا اور ان کی کتابیں عربوں کے ہاتھ آئیں تو سعد بن وقاص نے عمر بن خطاب کو لکھا کہ ان کتابوں کے متعلق کیا حکم ہے۔ حضرت عمر نے جواب میں حکم بھیجا "سب کو دریا برد کر دو اس لئے کہ اگر ان میں ہدایت ہے تو خدا نے ہمیں ان سے بہتر ذریعہ سے ہدایت کردی ہے اور اگر گمراہی ہے تو خداوند عالم نے اس طرح ہم کو گمراہی سے بچالیا" چنانچہ ان سب کتابوں کو دریا برد یا نذر آتش کردیا گیا۔

(کشف الظنون باب ایجاد علم الحکمۃ صفحہ ۴۴ طبع استنبول)

علامہ ابن خلدون نے بھی اپنے مقدمہ میں ایسا ہی لکھا ہے۔ یہ تو فارس کے متعلق ہوا۔ فتح اسکندریہ کے متعلق لکھتے ہوئے تاریخ التمدن الاسلامی میں بھی ایسا ہی واقعہ مذکور ہے۔

مذہب اور فلسفہ

مذہب اور فلسفہ کے نظریوں سے کما حقہ ناواقفیت کے سبب تصادم کے خیال نے رومی عیسائیوں کے ہاتھوں بھی فلسفہ کی کتابوں کو جلوا ڈالا تھا۔ فارس و روم کی فتح نے تعمیم کے ساتھ کل علوم کی بربادی سے مسلمانوں کے دامن کو بھی محفوظ نہ رہنے دیا۔

لیکن اس کے باوجود پھر بھی سارے مسلمان علم سے ایسا برتاؤ نہ کرتے تھے اور فلسفہ سے بھی کورے نہ تھے اور نہ سب نے مطلقاً فلسفہ سے مخالفت یا عداوت کا سلوک جائز رکھا۔ ابتدائے اسلام ہی سے کچھ تو قرآن اور سرورانس وجاں کے بتائے ہوئے عقلی قواعد اور کچھ آپ کے خاندانی تعلیمات اور ان کے مخصوص شاگردوں کے عزم واستقلال سے مسلمان عقلیات سے روشناس ہوگئے۔ اگرچہ بہتیرے ایسے بھی رہے جن کو سارے ہی علوم سے کوئی واسطہ نہ رہا، فلسفہ سے رابطہ کیسا۔

بقول مولانا شبلی

"فطرت نے انسانوں میں دو قسم کی طبیعتیں پیدا کی ہیں ایک وہ ہیں جو ہر بات میں عقل کو دخل دیتے ہیں اور کسی بات پر جب تک ان کی عقل میں نہ آئے یقین نہیں کرتے۔ دوسرے وہ جن کو اس قسم کی بحث اور چون و چرا کا مذاق نہیں ہوتا وہ جب کوئی بات کسی بزرگ یا معتقد علیہ سے سن لیتے ہیں تو اس کی لم اور علت سے بحث نہیں کرتے بلکہ آمنا وصدقنا کہکر سر تسلیم خم کردیتے ہیں۔ چونکہ دونوں قسم کی طبیعتیں

فطرت انسانی کا اقتضا ہیں اس لئے کوئی زمانہ ان سے خالی نہیں رہا۔ صحابہ کرام کے حالات پڑھو۔ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت نے فرمایا کہ زندوں کے گریہ و ماتم کرنے سے مردوں کو عذاب دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ سے لوگ یہ حدیث بیان کرتے ہیں وہ فرماتی ہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ خداوند عالم کہتا ہے "لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ" یعنی ایک کے گناہ کا دوسرے شخص سے مواخذہ نہیں ہوسکتا۔"

اس سے واضح ہے کہ ایک طرف تو خود عرب اور صحابہ میں فطری طور سے دو قسموں کے لوگ موجود تھے۔ دوسری طرف جب عرب کے باہر کے لوگ اور مختلف علم وعقیدے کے لوگ مسلمان ہوئے تو وہ محض کورانہ تقلید یا محدثین کے دباؤ سے باتوں کو بغیر سمجھ لینے کے نہیں مانتے تھے۔ اور خود سرور کائنات اور اصحاب میں سے وہ حضرات جن کا فطری ذوق اور علمی پایہ بلند تھا برابر ایسے لوگوں کو مطمئن اور ان کے شبہوں کا حل عقلی عنوان سے کرتے رہے۔ قرآن مجید میں ایسی آیتیں بہ کثرت موجود ہیں جن میں عقل سے کام لینے کی دعوت شد و مد کے ساتھ دی گئی ہے۔

قل ھاتوا برھانکم ، (بقرہ/۱۱۱)

ما لکم کیف تحکمون ، (قلم/۳۶)

افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا ، (محمد/ ۲۴) وغیرہ۔

چنانچہ عقلیات سے کام لینے اور فلسفہ سے استدلال کرنے کا طریقہ چلتا ہی رہا۔ اور اصل تو یہ ہے کہ منکر خدا کو قرآن سے یا منکر رسول کو حدیث رسول سے محجوج کرنے کی سعی نہایت غیر عاقلانہ انداز ہے۔ قرآن مجید نے غیر مسلمین کے سامنے ہمیشہ عقلی استدلال پیش فرمایا ہے اور سرور کائنات کی نبوت بھی عقلی ہی استدلال سے ثابت وواضح ہے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ عقلیات اور مسائل فلسفیہ مسلمانوں میں پھیلتے رہے تو ظاہر ہے کہ دو حق کبھی متناقض ومتضاد ہو بھی نہیں سکتے۔ خدا اور رسول کی کل تعلیم حق ہے فلسفہ کے ان مسائل سے جو صحیح اور مطابق واقع ہیں کہیں بھی نہیں ٹکراتی۔ فلسفہ کا مسلمانوں میں شائع ہوتے جانا اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے بیان کردہ اصول اور حقیقی فلسفہ کا تطابق ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جہاں فروعی اور جزئی اختلاف ہیں وہاں فلسفہ کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض تو مذہب کے معاملہ میں فلسفہ اور عقل سے کام لینا بالکل غلط ہی سمجھتے ہیں اور بعض اس کو ضروری اور نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور زمانہ حال کی اصطلاح کی بنا پر ان کو (Rationolist) کہہ سکتے ہیں۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ لیکن علم کلام کی کتابیں دیکھنے والوں کو اس کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ عقل وعقلیات کس کے اصول میں معتبر اور کس کے یہاں منکر ہیں۔

یہاں پر یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ عام اسلام کے متعلق فلسفہ یا عقلیات وعلوم طبعیات کے اعتبار سے رائے قائم کرنے میں جلدی سے کام لینے کے بجائے مختلف مذاہب کی اپنی اپنی کتابیں دیکھکر کوئی رائے قائم کرنا صحیح ہوگا۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک فرقہ نے دوسرے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کا اعتبار بھی اسی وقت قائم ہوگا جب منقول عنہ کا پورا حوالہ خود دیکھ لیا جائے ورنہ تدلیس وتلبیس دوسروں کو بدنام کرنے کی نامحمود کوشش کا شکار ہو جانا بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ اور واقعات اس کے شاہد ہیں۔

اختلاف کا نتیجہ

مسلمانوں میں اختلافات کی یہ حد پہونچی ہے کہ کوئی حسن وقبح اشیاء کو عقلی جانتا ہے اور کوئی ان کو محض نقلی جانتا ہے۔ ایک خدا کے لئے بہت سے امور عقلاً واجب ولازم جانتا ہے مثلاً یہ کہ خدا پر واجب ہے کہ جو کوئی نیک ہو اسے اچھا بدلہ دے اور جنت میں بھیجے اور جو کوئی برا ہو اس کو ان گناہوں کی سزا دے جو قابل بخشش ہوں۔ لیکن یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ نیکوکاروں کو دوزخ میں بھیج دے اور بدکاروں کو جنت میں بھیج دے۔ دوسرا کہتا ہے کہ خدا پر کچھ واجب نہیں ہے چاہے سب بدوں کو جنت میں بھیج دے اور کل نیکوکاروں کو دوزخ میں ڈال دے۔ مظلوم کی داد نہ دے، ظالم کو راحت وآرام بخشے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایک کہتا ہے کہ خدا ہرگز تکلیف مالا یطاق نہیں دے سکتا ورنہ وہ حکیم وعادل نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ قادر علی الاطلاق ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ قدرت کو عدل وحکمت کے خلاف استعمال کرے۔ دوسرا کہتا ہے شریعت کو عقل سے کیا مطلب۔ وہ خدا ہے تکلیف مالا یطاق دے سکتا ہے اور جو اس کی تعمیل نہ کرے اس کی سزا کر دے۔ اور باوجود اس کے وہ عادل بھی باقی رہے گا۔ مسلمان ہی کیا کوئی مذہب اختلاف خیال سے مبرا نہیں۔ بلکہ جو لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں بلکہ صرف فلسفہ وعقل کی پیروی کا دم بھرتے ہیں وہ بھی اختلافات سے پاک نہیں۔ بڑے بڑے فلاسفہ میں بنیادی اختلافات ملتے ہیں۔ افلاطون وارسطو ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ متناقض اقوال میں جس طرح تمام فلاسفہ صحت پر نہیں ہو سکتے اسی طرح فلاسفہ اسلام میں بھی دو متناقض رائے رکھنے والوں میں حق ایک ہی کے

ساتھ ہوگا۔ اجتماع نقیضین تو محال ہے۔ لہٰذا ایک تحقیق کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ غلط اور صحیح کو جدا جدا کر کے اس کے بعد کوئی رائے قائم کرے۔

مخفی نہ رہے کہ اسلام ایک مستقل مکمل اور عقلی مذہب ہے جس کے اصول عقائد اور قواعد عمل بڑی توضیح سے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ اسلام کو نہ بالکل افلاطونی فلسفہ سے اتفاق ہے نہ ارسطو کے فلسفہ سے۔ نہ کل افلاطونی نظریات سے اختلاف ہے، نہ ارسطو کے بیانات سے۔ اور اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جسے آج کل جدید فلسفہ کہا جاتا ہے اس سے بھی اسلام نہ حرف بحرف متفق ہے نہ لفظ بلفظ مخالف۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں قدیم فلسفہ آیا بھی تو نہ اس لئے کہ وہ حرف بحرف مان لیا جائے بلکہ اس لئے کہ معلوم تو ہو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اگر اس کی کوئی بات قابل تسلیم ہے بیشک مان لی جائے اور جو خلاف واقع ہو یا حریت فکریہ کے معیار پر پورا نہ اترے اسے رد کر دیا جائے۔

اس طرح مسلمانوں میں فلسفہ خالص فلسفہ رہنے کے بجائے علم کلام بن گیا۔

یا یوں کہئے کہ فلسفہ قدماء کی جو باتیں ماننے کی تھیں انہیں دلائل سے موید، مضبوط کر کے، چھان پرکھ کے ناقابل اعتراض قرار دیا گیا اور جو ناقابل تسلیم تھیں انہیں فلاسفہ کے بیان کردہ قواعد کے ذریعہ کمزور اور ناقابل تسلیم ثابت کر کے لغو اور مہمل قرار دے دیا گیا۔

جدید فلسفہ کے خاص مسائل

افسوس ہے کہ جدید فلسفہ کے وہ خاص مسائل جو قدیم فلاسفہ نے نہیں بیان کئے ہوں ممتاز طریقہ سے معلوم نہیں ہوتے۔ اور نہ بظاہر ابھی تک کوئی ایسا مسئلہ جو واقعتاً ناقابل تغییر تحقیق کی حد تک پہونچ گیا ہو معلوم ہو سکا ہے، جو اسلام کے کسی لازمی عقیدے یا تعلیم کے مخالف ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہ حضرات جو جدید فلسفہ کے مسائل سے واقف ہیں ان مسائل کو یکجا کر دیتے یا کم از کم ان افراد تک پہونچا دیتے جو تعلیم اسلام سے کماحقہ واقف ہیں۔ ہر مسلمان صرف مسلمان ہونے سے تمام تعلیمات اسلام کا عالم نہیں ہو جاتا اس کے بعد معلوم ہونا آسان ہوتا کہ فلسفہ جدید اور اسلام میں تصادم ہے بھی کہ نہیں۔ خصوصاً وہ مسائل جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ وہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں۔ جہاں تک میری واقفیت کام کرتی ہے بظاہر تو کوئی ایسا مسئلہ نہ ملے گا۔ صرف مغربیت سے مرعوبیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ فلسفہ کسی دوسرے مذہب سے متصادم ہوتا ہو تو ہو اسلام کبھی سچے فلسفے سے ٹکرا ہی نہیں سکتا۔ اگر بظاہر کوئی تصادم نظر آتا ہو تو علمائے اسلام علمی اور عقلی طریقہ سے اسے حل کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ جو لوگ جدید فلسفہ اور سائنس کے مسائل سے مرعوب ہو سکتے ہیں وہ وہی ہیں جن کو عقائد اسلامیہ کی اطلاع نہیں یا ایسی اطلاع ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ یا وہ لوگ ہیں جو استدلال کے طریقہ سے ناواقف ہیں۔ جزئی اور نظریات کو کلی اور ثابتات کا درجہ دے کر استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں یا از ین قبیل غلط طریقہ استدلال کو حقیقی اور واقعی مسلمہ سمجھتے ہیں یا پھر غلط عقیدہ کو اسلام کا عقیدہ سمجھ رہے ہیں۔ ذرا غور

کی نظر کی جائے تو سائنس کے تحقیقات بجلی، ریڈیوان کے خواص اور استقدام وغیرہ
سے تو اسلامی تعلیم کی تائید ہی ہوتی ہے۔

مولانا شبلی صاحب تحریر فرماتے ہیں

"دنیا میں عموماً ہر قوم کو مذہب ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا ہے
لیکن مسلمانوں کو اور بھی زیادہ عزیز تھا اور ہونا چاہیے تھا۔
مسلمان کسی نسل، کسی خاندان، کسی ملک، کسی آبادی کے افراد
کا نام نہیں۔ مسلمانوں کی قومیت کا عنصر یا مایۂ خمیر جو کچھ کہو
صرف مذہب ہے۔ اس لئے اگر مذہب کی حیثیت الگ
کرلی جائے تو قومیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اسی خیال کا اثر تھا
کہ مسلمانوں نے مذہب کو ہر قسم کے خطروں سے بچانے
کے لئے ہر زمانہ میں حیرت انگیز کوششیں کیں لیکن دولت
عباسیہ میں جب یونان و فارس کے علمی ذخیرے عربی زبان
میں آئے اور تمام قوموں کو مذہبی مباحثات و مناظرات میں
عام آزادی دی گئی تو اسلام کو ایک بڑے خطرے کا سامنا
پیش آیا۔ پارسی، عیسائی، یہودی، زنادقہ ہر طرف اٹھ
کھڑے ہوئے اور فتوحات اسلام کے آغاز میں ان کو جو
صدمہ اسلام کی تلوار سے پہنچ چکا تھا اس کا انتقام قلم سے لینا
چاہا۔ عقائد و مسائل اسلام پر اس آزادی اور بیباکی سے نکتہ
چینیاں کیں کہ ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد متزلزل ہو
گئے اس وقت اگرچہ نہایت آسانی سے ممکن تھا کہ حکومت
کے زور سے نکتہ چینیوں کی زبانیں بند کر دی جاتیں لیکن
مسلمانوں کی آزاد خیالی نے اس ننگ کو گوارا نہ کیا کہ قلم کا

جواب تلوار سے دیا جائے۔ مسلمانوں نے نہایت شوق او
محنت سے فلسفہ سیکھا اور جو ہتھیار مخالفین نے اسلام کے
مقابلہ میں استعمال کئے تھے انہیں سے ان کے وار رد کئے۔
انہیں معرکوں کے کارنامے ہیں جو آج علم کلام کے نام سے
مشہور ہیں۔"

اس طرح فلسفہ اور اسلام کا علم کلام ایک ہو جاتا ہے اور واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ البتہ مولانا کی رائے سے میں اتنا اختلاف کرنا چاہتا ہوں کہ دولت عباسیہ میں ترجمہ علوم کے وقت سے نہیں بلکہ ایسی چھیڑ چھاڑ تو بنی عباس کیا بنی امیہ سے بھی پہلے شروع ہو چکی تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ابتدائے اسلام ہی سے یہ بحثیں شروع ہو گئی تھیں۔ کیا سرور کائنات کے عہد میں کوئی فلسفی یا علوم عقلیہ کا ماہر مسلمان نہ ہوا تھا۔ یا بالکل بے سمجھے یا بزور شمشیر مسلمان ہوا تھا۔ احبار و کاہنین، روم اور فارس کے باشندے اس وقت بھی مسلمان ہوئے تھے اور اپنی تسلی کر کے مسلمان ہوئے تھے اور یہ سلسلہ برابر ہی جاری رہا۔ اور برابر مباحثے ہوتے رہے۔ ایسے مباحثات تاریخوں اور احتجاج کی کتابوں میں مذکور بھی ہیں۔ ہجرت حبشہ کے وقت کا استدلال، وفد نجران سے محاجہ، بحیرا راہب کا تجسس وغیرہ ایسے کثیر واقعات موجود ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ خود قرآن مجید میں جو عقلی مباحثات مذکور ہیں وہی کچھ کم نہیں۔ خود مولانا عقائد کے اختلاف کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اختلاف عقائد کے اگرچہ یہ سب اسباب فراہم تھے لیکن
ابتدا پالیٹکس یعنی ملکی ضروریات سے ہوئی۔ بنوامیہ کے زمانہ
میں چونکہ سفاکی کا بازار گرم رہتا تھا، طبیعتوں میں شورش پیدا
ہوئی لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی کی زبان پر آتا تھا تو
طرفداران حکومت یہ کہکر اس کو چپ کر دیتے تھے کہ جو کچھ

ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ۔ ہم کو دم مارنا نہیں چاہیے" **امنا بالقدر خیرہ و شرہ**" . حجاج بن یوسف کے زمانہ میں جو ظلم و جور کا دیوتا تھا معبد جہنی ایک شخص تھا جس نے صحابہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور دلیر و راست گو تھا۔ وہ امام حسن بصری کے درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے امام صاحب سے عرض کی کہ بنی امیہ کی طرف سے قضا و قدر کا جو عذر پیش کیا جاتا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ امام صاحب نے کہا کہ 'یہ خدا کے دشمن جھوٹے ہیں' وہ پہلے سے بنی امیہ کی زیادتیوں پر طیش سے بھرا ہوا تھا اب علانیہ بغاوت کی اور جان سے مارا گیا۔" انتہیٰ

ظاہر ہے کہ معبد کا اعتراض مسئلہ قضا وقدر اور بندے کے فاعل مختار ہونے کی بنا پر خالص فلسفی اور عقلی تھا اور جواب بھی عقلی تھا۔ یہ سوال جواب بنی عباس سے قبل کا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فقط یہی ایک سوال اور ایک ہی شخص کا سوال نہ رہا ہوگا۔ جبکہ بنائے اعتراض پہلے سے اور کثرت سے موجود تھی۔ اور جب اختلاف کی ابتدا پالیٹکس مانی جائے تو پھر جس جگہ سے پالیٹکس کا دخل اسلام میں ہوا ہے وہیں سے یہ اختلافات بھی ماننے چاہئیں اور تاریخ اسلام سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ پالیٹکس کا دخل حجاج کے وقت سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے بہت پہلے، بہت دور سے چلا آرہا تھا۔ چنانچہ حضرت علی پر سیاست (پالیٹکس) نہ جاننے کا اعتراض اور آپ کا" **لولا الدین و التقی لکنت ادھی**" کہنا اس کی پوری شہادت ہے۔ سیاست جانے نہ جاننے کی گفتگو بتلاتی ہے کہ کچھ لوگوں کو سیاست جاننے والا خیال کیا جاتا تھا۔

فلسفی اعتراضات اور عقلی جوابات کی بہ بہ کثرت مثالیں حضرت علی بلکہ خود سرور کائنات کی زبانی کتب تفاسیر و احادیث میں موجود ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ اعتراضات اور جوابات کی فہرست لمبی ہوتی گئی اور یہ حقیقت نا قابل انکار ہے کہ اشعری مذاق اور مشرب صاحبان عقل کے لئے کبھی تشفی بخش نہ ہوا، نہ اس میں اس کی صلاحیت ہے۔ بقول خود مولانا شبلی کے اشاعرہ کے یہ عقائد کہ خدا کے صفات نہ عین ذات ہیں نہ خارج ذات۔ خدا محالات کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ خدا کو عدل اور انصاف کرنا ضروری نہیں۔ خدا عبادت کے عوض میں عذاب دے سکتا ہے اور گناہ کے بدلے میں انعام اور اگر وہ ایسا کرے تو ناانصافی نہیں ہے۔ ازیں قبیل عقائد سے عقل مطمئن ہو سکتی ہے یا نہیں اس کا انصاف آپ خود فرمائیں۔

خلاصہ یہ کہ نہ صرف بنی عباس کے وقت سے بلکہ ابتدائے اسلام اور بالکل ابتدا سے وجود باری، توحید، عدل، نبوت، صفات نبوت، حیوٰۃ بعد الموت، جزا سزا، معلول علت وغیرہ سب پر بحثیں جاری تھیں۔ البتہ ان کا نام علیحدہ سے نہ تھا۔ اور کتابی صورت میں فلسفہ کی تصنیف نہیں کہلاتی تھیں بلکہ کبھی حدیث، کبھی معجزہ، کبھی کسی اور نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ بلکہ اس عہد میں بعض بعض کتابیں بھی علم کلام کی موجود ہو چکی تھیں۔ سلیم بن قیس کی کتاب آج بھی موجود ہے، ابو ہاشم جو امیر المومنین کے پوتے اور محمد حنفیہ کے صاحبزادے تھے، ان کی کتاب کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اور اگر ان احادیث اور سوالات و جوابات کو بطور خطبہ یا گفتگو کتابوں میں علیحدہ کر کے مرتب کیا جائے تو مسائل فلسفیہ کی معتد بہ مقدار اکٹھی ہو سکتی ہے۔ اور جو لوگ خلاف عقل عقائد رکھتے یا دوسروں سے منوانا چاہتے ہوں ان کا متزلزل ہو جانا بھی ضروری تھا۔ اس کے لئے بھی بنی عباس کا عہد مخصوص نہ قرار دینا چاہیے۔ زمانہ آگے بڑھتا گیا اور آخر کار مامون کا دور آیا اور بقول بعض مورخین مامون نے ارسطو کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اچھائی کس کو کہتے ہیں ارسطو نے کہا جسے عقل اچھا کہے، اس کے بعد جسے شریعت اچھا کہے۔ خواب سے بیدار ہو کر مامون کو شوق ہوا کہ ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ کرایا جائے۔ چنانچہ شاہ روم سے اس مقصد کے لئے کتابیں منگوائیں اور پھر

ترجمہ کا کام اس زور وشور سے ہوا جس کا مفصل ذکر تواریخ میں موجود ہے۔ افلاطون، ارسطو، جالینوس کی کتابوں کے ترجمہ کے علاوہ فارسی، ہندی، نبطی زبانوں کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ اور اشعریت مامون کے لئے بھی تسلی بخش نہ ثابت رہ سکی اور اسے اعتزال کی گود میں پناہ لینی پڑی۔ اگر چہ اس بیان سے مامون کا تقدم ظاہر ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے مامون کے پردادا منصور دوانیقی ہی کے وقت ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ جیسا کہ مولانا شبلی کا بیان ہے کہ

> "خلیفہ منصور نے دنیا کی تمام زبانوں کی علمی اور مذہبی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرائیں ان کو پڑھ کر مسلمانوں میں سیکڑوں آدمیوں کے عقیدے متزلزل ہو گئے۔" انتہی

فلسفہ میں مسلمانوں کی تصانیف

اور نہ صرف ترجمہ بلکہ فلسفہ میں خود مسلمانوں نے بھی کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ کسی عقیدہ کو سمجھ کر نہیں اختیار کرتے یا یوں کہئے کہ جن کی عقلوں کو معطل کر دیا گیا ہو اور صریحی خلاف عقل وفطرت عقیدہ رکھنے کا نام سچا اسلام بتایا گیا ہو ان کو متزلزل ہو جانا ہی چاہئے۔ جہاں مذاق یہ پیدا کر دیا گیا ہو کہ "محدثین سے لوگ پوچھتے تھے کہ خدا جب جسمانی نہیں ہے تو عرش پر کیونکر متمکن ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ

الکیف مجہول والسوال بدعۃ کیفیت معلوم نہیں اور سوال کرنا بدعت ہے۔"

وہاں جب عقلی استدلال آئے، اور سمجھ میں آنے والی باتیں دکھلائی جائیں گی تو معلوم نہیں مگر ایمان لے آؤ' کے عقیدہ میں تزلزل ضروری ہے۔ اور جب ایسے عقائد جو عقلی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں گے دوسروں کو سنائے جائیں گے تو وہ بجائے قبول کرنے کے اس کا مضحکہ اڑائیں گے۔

لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حکمت وعقلیات کا جو چشمہ دہن رسول سے پھوٹا تھا، آپ کے خاندان اور خاص وابستگان میں ہمیشہ جوش زن رہا اور بجائے اس کے کہ وہاں کسی فرد میں تزلزل پیدا ہوتا ثبات اور اثبات مضبوط ہوتا گیا اور ان کی تعداد باوجود ہر قسم کی جسمانی وروحانی ایذا اور قتل وغارت کے بڑھتی ہی گئی۔ زمانہ اور حکومت ان کے ناموافق رہی مگر عزم واستقلال نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ چنانچہ حضرت ابوذر کے مناظرات اور اہل بیت رسول کے شاگردوں کے تعلیمات سے بہرہ مند گروہ

برابر عقل کی روشنی پھیلاتا رہا۔امام زین العابدین علیہ السلام کی دعاؤں کا مجموعہ ''صحیفہ کاملہ'' اگر چہ بظاہر دعا ہے لیکن ایک ایک دعا میں الٰہیات کے ایسے ایسے مسائل مذکور ہیں جو بڑے بڑے فلاسفہ حل نہ کر سکے۔ جبر و اختیار، افعال عباد، تکلیف مالا یطاق، عدل، حیوٰۃ بعد الموت، بقاء نفس، حسن و قبح عقلی، فلکیات اور طبعیات، علم نفس اور علم الحیوانات غرض سبھی کچھ مذکور اور باحسن وجوہ مذکور ہیں۔ صرف ایک دعا طلب مکارم الاخلاق کو پڑھیئے تو آپ کو حکمۂ عملیہ کا پورا نقشہ دکھائی دے گا اور سمجھ میں آجائے گا کہ انسان کامل کس کو کہتے ہیں۔ روحانی امراض کیا اور کس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا علاج کیا ہے۔ ایک دعائے ہلال ہے جس میں علم ہیئۃ کے نکتے موجود ہیں۔

ایھا الخلق المطیع الدائب السریع، کے عنوان کو دیکھئے۔ دعا کی بلاغت اور داعی کی کامل معرفت، مخاطب کا کمال، اس کے احوال سب کچھ روشن ہو جائیں گے۔ اس کتاب کا دیباچہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان رسول کو علم سے کتنی محبت اور اس کی حفاظت کا کتنا شوق تھا۔ نااہلوں کے قبضہ میں آکر رائگاں جانے کا کتنا اندیشہ تھا۔

عقل پرست یا معتزلہ تک جو روشنی پہنچی تھی وہ تعلیم گاہ مدینہ ہی سے چلی تھی۔ حسن بصری نے بنی فاطمہ کے مرکز میں تعلیم حاصل کی اور جب بصرہ میں گئے تو بصری مشہور ہو گئے۔ ان سے واصل بن عطا نے سیکھا اور اس طرح عقلیات کو بنی عباس سے بہت قبل سینہ بہ سینہ پھیلا دیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ حکومت کی پالیسی اس کے مخالف رہی اور اس کو کچلا گیا اس قدیم مذہب کو دبایا گیا۔ اور جدید اشعری مذہب کو رائج کیا گیا جس نے خدا کی عدالت سے توبہ کرنا ضروری قرار دیا۔ بقول مولانا شبلی

> ''علمائے کلام گرفتار ہو کر قید خانے بھیج دیئے گئے اور حکم دے دیا گیا کہ علم کلام کے متعلق کوئی کچھ لکھنے نہ پائے تاہم بعض اسباب ایسے پیش آئے کہ مجبوراً ہارون الرشید کو علم کلام کی قدر کرنی پڑی۔''

علم کلام کا تو مطلب ہی یہ تھا کہ عقائد و تعلیمات اسلام کو استدلال سے ثابت کیا جائے۔ چنانچہ عقلیات سے واسطہ رکھنے والے اپنا کام کیئے جا رہے تھے۔ ابو ہاشم بن محمد بن علی بن ابیطالب علیہ السلام کی علم کلام کی تصنیف کا تذکرہ معارف ابن قتیبہ اور فہرست بن ندیم میں موجود ہے۔ یہ ابو ہاشم ابوالہذیل سے بھی مقدم ہیں۔

غیلان دمشقی نے بھی ابو ہاشم کے والد محمد حنفیہ سے بیک واسطہ تعلیم پائی تھی۔ اس کا ذکر مولانا شبلی صاحب نے الکلام میں کیا ہے۔ ان کا آزادانہ مسئلہ جبر کی رد اور باثر امر بالمعروف کتابوں میں ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ عقلیات اور مسائل فلسفیہ کی ابتدا تعلیم تو سر چشمۂ وحی سے ہوئی لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کم اور گمنام انداز میں رہی۔ جب خود حکومت نے مذہب اعتزال اختیار کر لیا تو عقلیات اور فلسفیات کو پھولنے پھلنے کا موقع ہاتھ آیا۔

عیسویت کے بعد غریب فلسفہ اپنی قسمت یہاں بھی ساتھ لایا۔ یہاں بھی ظاہری سطح کے لوگوں نے اسے جرم قرار دیا اور صاحبان غور و فکر نے جن کے عقائد کی اساس عقل کے مطابق تھی اسے فائدہ مند اور فیض رساں بتایا۔ مولانا شبلی صاحب فرماتے ہیں کہ

> ''محدثین کی زبانی عام طور سے روایتیں منقول ہیں کہ جب کسی کو جوہر، عرض، مادہ وغیرہ الفاظ استعمال کرتے سنو تو سمجھ لو کہ وہ گمراہ ہے۔''

لطیفہ تو یہ ہے کہ اس طرح نہ صرف فلسفہ کو بلکہ علم کلام کو بھی جو دراصل فلسفہ کے ذریعہ فلسفہ باطل کی رد کا نام ہے حرام بتایا گیا۔ چنانچہ علامہ غزالی نے امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل، سفیان اور کل اہل حدیث کو انہیں لوگوں میں شمار کیا ہے جو علم کلام کو حرام جانتے تھے اور ان لوگوں کو اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں تھا۔ جو روایتیں بیان

کرتے تھے اگر ان کو صحیح مان لیا جائے تو عقل کا ساتھ چھوٹتا ہے اور اگر عقل سے کام لیا جائے تو روایتیں قابل مضحکہ ٹھہرتی ہیں ۔خدا کا غیر مجسم ہونا اور اسکا عرش پر اس طرح بیٹھنا کہ عرش بوجھ سے چرّائے جیسا کہ مسند امام احمد بن حنبل میں ہے ۔آخر علم کلام میں عقلی بحث کرنے والوں کو کیسے مطمئن کر سکتا تھا ۔لیکن کہیں عقل بھی معطل رہ سکتی تھی ۔فلسفہ اور عقلیات پڑھے گئے اور ان سے کام لیا گیا اور خصوصاً گروہ معتزلہ جو بانی اسلام سے قریب اور اشعریوں کے وجود سے پہلے موجود تھا لیکن حکومت کی رائے کے مخالف ہونے کے سبب ابھر نہ سکتا تھا ،وہ عقلیات کے میدان میں فطرتاً پیش پیش رہا۔ ابوالہذیل کا میلاس مجوسی سے بحث کر کے اس کو مع تین ہزار آدمیوں کے دائرۂ اسلام میں داخل کرنا تاریخوں میں مذکور ہے ۔ظاہر ہے کہ یہ عقل وکلام ہی کا فیض تھا ۔مولانا شبلی لکھتے ہیں

"مامون رشید کے دربار میں جس قدر علمائے کلام تھے ان
میں سب سے پیشتر ابوالہذیل اور نظام تھے ۔"

اسی زمانہ میں ہشام ابن الحکم کوفی ایک مشہور متکلم تھا وہ یحیٰی برمکی کے مجالس علمی کا افسر اور علوم عقلیہ کا ماہر تھا ابوالہذیل مناظرہ میں اگر کسی سے دبتا تھا تو اسی سے دبتا تھا ۔مسعودی نے اس کے متعدد مناظرے نقل کئے ہیں جن میں اس نے ابوالہذیل پر فتح پائی ۔ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں اس کی بہت سی تصنیفات کا ذکر کیا ہے ،جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں

الرد علی الزنادقه

الرد علی اصحاب الاثنین

الرد علی اصحاب الطبایع (یعنی materialist کا رد)

"**کتاب الرد علی ارسطو طالیس فی التوحید**

یہ کتابیں آج ناپید ہیں لیکن کتابوں کے نام سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کیسے اہم مضامین

پر تھیں ۔اسی کے ساتھ اگر یہ بھی معلوم کر لیا جائے کہ ہشام اور ابوالہذیل اسلام کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور کن کی تعلیم کا ذریعہ کون سی درسگاہ تھی تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شیعوں کا تعلق عقل اور فلسفہ سے کتنا ہے ۔**لباب المعارف العلمیہ** میں (جو پشاور اسلامیہ کالج کے علوم مشرقیہ کی لائبریری کی فہرست ہے) **کتاب اخوان الصفا** کے حالات میں صفحہ ۲۲۸ پر لکھا ہے ۔خلیفہ متوکل اور اس کے جانشینوں کے عہد میں مذہبی تقشف کا پہلو غالب ہو گیا تھا اور فلسفیانہ خیالات بالکل دبا دیئے گئے تھے لیکن جب عنان حکومت آل بویہ کے ہاتھ میں آئی اور عباسیوں کی سلطنت برائے نام رہ گئی تو ان کے زمانہ میں پھر فلسفہ کا زور ہوا اور لوگ نہایت آزادی کے ساتھ خیالات کا اظہار کرنے لگے ۔جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا اپنا مذہب شیعہ تھا اور اس لئے وہ اہلسنت کے عقاید کی حمایت میں بے اعتنائی برتتے تھے ۔اور سچ تو یہ ہے کہ تشیع اور تفلسف میں کچھ قدرتی رشتہ جیسا ہے ۔الغرض اسی عہد میں یعنی چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بمقام بصرہ مسلمان فلاسفروں نے اخوان الصفا کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی ۔جس کے باقاعدہ جلسے ہوتے اور مختلف فلسفیانہ مباحث پر مذاکرہ ہوا کرتا تھا ۔اسی سوسائٹی نے اکیاون چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے ،جس کا مجموعہ آج اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہے ۔

ہشام کے مناظرات شیعہ کتب میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح علم کلام اور فلسفہ کے اور بہ کثرت علماء شیعوں میں ابتدائے اسلام سے چلے آرہے ہیں ۔اصحاب میں سے ، ابوالطفیل عامر بن واثلہ ، سعد بن عبادہ ، قیس بن سعد بن عبادہ ، جناب ابوذر و سلمان ، محمد بن ابی بکر ، مالک اشتر وغیرہم کی بحثیں اب بھی کتابوں میں مذکور ہیں ۔ان کے بعد تابعین اور ان کے تبع تابعین کا سلسلہ مسلسل موجود ہے ۔صاحب منتہی المقال نے نجاشی سے نقل کیا ہے کہ عیسٰی بن روضہ منصور کے اصحاب میں تھے اور وہ جید الکلام متکلم تھے ۔جاحظ کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ تشیع کی حقیقت پر سب سے

پہلے کمیت نے مناظرہ کیا۔لیکن صاحب کتاب ''الشیعہ و فنون الاسلام''

''حضرت ابوذر غفاری ان سے بھی مقدم ہیں جنہوں نے
شام کے باشندوں میں سے ایک جماعت کو راہ ہدایت دکھا
دی۔اور فہرست ابن ندیم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ سب سے
پہلے بزرگ علی بن اسماعیل ابن میثم تمار ہیں۔لیکن عیسیٰ بن
روضہ ان سے مقدم ہیں اور کمیت ہشام کے معاصرین ہیں۔''

غرضکہ علی بن اسماعیل بن میثم سے بہت قبل ابوذر اور ان کے ساتھیوں نے مناظرات کئے جن کا تذکرہ کتب احتجاج میں موجود ہے۔اور اصحاب امیرالمومنین میں بہت سے حضرات متکلم اور مناظر کی فہرست میں مندرج ہیں جیسا کہ کتب رجال سے واضح ہے۔اور امام حسن وحسین سے اختصاص رکھنے والوں نے اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا ہے جیسا کہ کتب تاریخ اس کے شاہد عدل ہیں۔

ہشام کا سلسلہ چونکہ کھلم کھلا حکومت کے ارکان سے ہوگیا تھا ان کا ذکر آنا لازم ہوگیا۔ورنہ یہ اس زمانہ میں قیس ماصر حمران اور مومن الطاق بھی کچھ کم مشہور متکلم نہ تھے۔جو بین الاسلامی مسائل پر بحث کے علاوہ غیر مسلمین سے فلسفیانہ بحثیں بھی کرتے اور بہت جلد ان کو ساکت کر دیتے۔قیس ماصر نے علم کلام کی تعلیم امام زین العابدین علیہ السلام سے حاصل کی تھی اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان کی اور مومن الطاق کی اسی باب میں خاص مدح فرمائی ہے۔

مولانا شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ

''عباسیوں کے زمانہ میں اسلام کو جس خطرہ کا سامنا ہوا تھا
آج اس سے کچھ بڑھ کر اندیشہ ہے۔مغربی علوم گھر گھر پھیل
گئے ہیں اور آزادی کا یہ عالم ہے کہ پہلے زمانہ میں حق کہنا اس
قدر سہل نہ تھا جتنا آج ناحق کہنا آسان ہے۔''

میں یہ عرض کروں گا کہ یہ دقت نہ صرف عباسیوں کے وقت میں پیدا ہوئی تھی نہ آج پیدا ہوتی ہے۔بلکہ اس سے قبل وبعد ہمیشہ رہی ہے۔معبد اور غیلان کا حال اوپر ہو چکا کہ یہ لوگ باوجود یکہ حکومت کے ہم مذہب نہ تھے۔فقط بعض باتوں میں حکومت کے خیالات سے مخالفت ہوگئی تھی اسلئے جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔
(ایسی صورت میں شیعوں کو بحث واستدلال میں کھل کے آنا کتنا دشوار رہا ہوگا۔اس کا اندازہ تاریخ دان ہی کر سکتے ہیں۔)

لیکن تواریخ میں باوجود ''قلم درکف دشمن است'' اب بھی ایسی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں جن میں حق وعقل کی بات کرنے والوں کو طرح طرح کی عقوبت کے ساتھ قتل کیا گیا ہے۔مالک بن نویرہ، سعد بن عبادہ، حجر بن عدی، صعصعہ بن صوحان، کمیل بن زیاد، عمرو بن حمق خزاعی، عبداللہ بن یقطر، ابوذر، امام نسائی وغیرہ لیکن حق کا اظہار کرنے والے کرتے ہی رہے۔

مختصر یہ کہ حق کہنا کبھی آسان نہ رہا اور بنی عباس و بنی امیہ کی خصوصیت نہیں رسول کی زندگی ہی سے حق وناحق مخلوط ہوگئے تھے اور ناحق کی کثرت اور حق کی قلت رسول کے وقت ہی ہوگئی تھی جنگ تبوک میں اور رفتہ رفتہ حق گویوں پر دنیا نہایت تنگ ہوتی چلی گئی۔لیکن یہ سلسلہ کبھی بند ہوا۔امام غزالی کا وقت چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ ان کے حالات میں مولانا شبلی کہتے ہیں:

''امام صاحب نے ابتدا میں اشعری طریقہ کی حمایت کی لیکن
بالآخر ان کی یہ رائے قائم ہوگئی کہ کہ اشعری طریقہ جمہور کے
لئے اچھا ہے لیکن نہ وہ اصل حقیقت پر مشتمل ہے نہ اس سے
حقیقی تشفی ہو سکتی ہے...اس بنا پر امام صاحب نے اشاعرہ
کے طریقہ سے الگ مسائل عقائد کی تشریح کی۔امام
صاحب کی یہ رائے تھی کہ اسرار شریعت عام طور پر ظاہر نہیں

کئے جاسکتے ۔اس بنا پر انہوں نے انہی کتابوں کو اشاعت دی
جو اشاعرہ کے اعتقاد کے موافق تھیں اور اپنے خاص مذاق
کے موافق جو کتابیں لکھیں ان کی نسبت تاکید کی کہ عام طور پر
شائع نہ کی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر امام
صاحب کا شمار اشاعرہ ہی میں کیا جاتا ہے۔ اور اس وجہ سے
علم کلام کا جو قدیم سلسلہ چلا آتا تھا اس میں کوئی معتد بہ تغیر بجز
اسکے نہیں ہوا کہ کلام میں فلسفہ شامل ہو گیا۔"

اور امام رازی کے حالات میں اشاعرہ کے جبریہ عقائد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"حقیقت یہ ہے کہ یہ مسائل اس قدر رواج عام پا گئے تھے
کہ ان سے انکار کر کے کوئی شخص زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔"

اصل یہ ہے کہ اس مذہب کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی گئی جو کبھی عقل اور فطرت کے اصول سے مطابق نہ ہو سکنے کے سبب صحیح الفکر یا غیر مبہوت ومخبوط انسان کو مطمئن کر ہی نہیں سکتے۔ جن مسائل کا خود مولانا کی تحریر سے اوپر ذکر ہو چکا ہے ان کے علاوہ توحید، نبوت، امامت، معاد سب میں ایسے ہی غیر عقلی عقائد کی وکالت کی گئی ہے۔ جب جاہ وجلب نفع کی خواہشوں نے مجبور کیا کہ انہیں متضاد اور مخالف عقل باتوں کو مذہب قرار دیا جائے اور اس کی مخالفت کرنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے۔

افضل کے رہتے ہوئے مفضول کی اطاعت کا حکم، خدا سے شر کا ہونا، نبی سے گناہ کا ہونا، امام کا باوجود فسق وفجور امام باقی رہنا، بندوں کا اپنے افعال میں مختار نہ ہونا، خدا کا عاقبت اور دنیا میں آنکھوں سے دیکھا جانا، خدا پر جزا وسزا کا لازم نہ ہونا وغیرہ کس عقل میں سما سکتے ہیں۔ چنانچہ جب آزاد ہو کر عقل سے کام لیتے ہیں تو کوئی اور رائے ہوتی ہے اور جب مذہبی روایات کی پابندی کا خیال آتا ہے تو دوسرا ہی رنگ

ہو جاتا ہے۔

جب امام غزالی اور امام رازی ایسے حضرات کو جان بچانے کی (یا ان باتوں کے محفوظ کرنے کی غرض سے جن کا تذکرہ خود امام رازی نے تفسیر کبیر میں علماء اہل کتاب کے اسلام نہ قبول کرنے کے باب میں کیا ہے) ضرورت پڑتی ہے تو ان لوگوں کا اندازہ کیجئے جو عوام اور حکومت کے عقائد سے علی العموم مخالف عقیدہ رکھتے تھے اور جب تک کوئی بات عقل میں نہ آجائے صرف سلف پرستی کو شعار نہ قرار دیتے تھے۔ انہیں تقیہ کرنے کے بغیر کیا چارہ تھا۔ چنانچہ اسی دباؤ کا اثر ہے کہ شیعہ عقائد جو عقل کے مطابق ہیں کم رواج پائے اور ان کی تعداد اقلیت میں ہی رہی۔ اور آج تک انہیں دبایا ہی جا رہا ہے۔ آج کی دنیا دیکھو، عالم کا چپہ چپہ ڈھونڈ ڈالو ہر مذہب والے کو آزادی ہے مگر شیعوں کو کوئی ہاتھ کھول کر نماز تک کی آزادی آج ایشیا اور ہندوستان میں نصیب نہیں۔ اظہار عقائد کا تو ذکر ہی کیا۔ کاش غیر مسلم افراد کو یہ موقع ملتا کہ وہ شیعہ عقائد دیکھتے اور جو کتابیں جلانے ڈوبانے سے بچ رہی ہیں ان کا مطالعہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ سارے مسلمان ایسے نہیں جو عقل وفلسفہ کے دشمن ہیں۔ کو اس کثرت سے نہیں جتنا ہونا چاہیے پھر بھی جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو علم کلام میں متبعین اہل بیت رسول کا بڑا اہم درجہ دکھائی دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب اور جہاں حکومت کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی تو ان کو اپنے عقائد سیکھنے سکھانے کا موقع مل گیا اور جب حکومت کی گرفت سخت ہوئی تو تقیہ کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ یہ امر بھی لطف سے خالی نہیں کہ امام غزالی ورازی کا عقائد کو عوام سے چھپانا اور اصل حقیقت کے خلاف عقائد کا بیان کرنا جیسا کہ اوپر ذکر ہوا قابل اعتراض نہیں بلکہ ممدوح سمجھا گیا۔ لیکن قرآن وحدیث کی اصطلاح تقیہ پر شیعوں کا عمل کرنا قابل اعتراض ومذموم سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے۔

اللہ جانے جزا وسزا کا معیار کیسا ہوگا عوام کا عقیدہ یا علماء کا اس کا فیصلہ مولانا

شبلی ہی صاحب کرتے تو اچھا تھا۔

بہر حال ہشام بن حکم کا کچھ حال ابھی ذکر ہوا جس سے ہشام کے تبحر او رقوت استدلال کا اندازہ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ مولانا شبلی لکھتے ہیں

> ''خلیفہ مہدی کے علاوہ دربار کے اور امرا نے بھی علم کلام کی طرف توجہ کی۔ یحییٰ بن خالد برمکی جو دولت عباسیہ کی روح روان خلیفہ مہدی کا وزیر اعظم اور سلطنت کا دست وبازو تھا۔ اس نے خاص علم کلام کے مباحثات کے لئے دربار میں ایک مجلس مقرر کی جس کا تذکرہ مورخ مسعودی نے ان الفاظ میں کیا ہے
>
> **وکان یحییٰ بن خالد ذا بحث و نظر و له مجلس یجتمع فیه اهل الکلام من اهل الاسلام وغیرهم**
>
> (یحییٰ بن خالد مناظرہ دان اور صاحب نظر تھا۔ ایک جلسہ کیا کرتا تھا جس میں مسلمان اور غیر مسلم ہر مذہب کے اہل کلام جمع ہوتے تھے) اس مجلس کا قیم (سکریٹری) ہشام بن الحکم ایک مشہور فاضل تھا۔''

البتہ یہ بتلانا مولانا نے ضروری نہ سمجھا کہ ہشام کا مذہب کیا تھا۔ ہشام بن حکم کا مذہب تشیع تھا۔

اصل یہ ہے کہ گذشتہ سلطنت کے عیوب اور اس کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا ہی جدید سلطنت کا باعث بنتا ہے۔ بنی عباس کی حکومت بنی امیہ کے مظالم اور ان کی ہر طرح کی نالائقی کے اعلان اور اس سے لوگوں کو چھٹکارا دلانے اور مظلوموں کی دادرسی کے وعدوں سے قائم ہوئی تھی۔ آل محمد کے حق اور ان کی مظلومیت کی تبلیغ کو بنی امیہ کے استیصال کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ اس طرح بنی امیہ کو مغلوب کرنے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہو گیا اور رفتہ رفتہ بنی عباس ان کے مقابلہ میں زور پکڑتے گئے۔

محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور ابراہیم بن محمد کی زندگی تو مخفی دعوتوں میں

گزر گئی۔ آخر ابوالعباس سفاح بن محمد کو خلافت مل ہی گی۔ **الملک عقیم** عربی کی مثل مشہور ہے۔ سلطنت ملنے اور حاصل کرنے میں کیسا وعدہ اور کیسی راستبازی ادھر قدم جما اور سارے وعدے ہوا ہو گئے۔ بنی فاطمہ سے ہمدردی کے وعدے بے دردیوں سے بدلنے لگے۔ چنانچہ ابو سلمہ یہ دیکھ کر کہ بنی عباس اس وعدے کے خلاف عمل کرتے ہیں جس پر انہوں نے لوگوں سے بیعت لی تھی (یعنی آل محمد کی نصرت) بنی عباس سے بددل ہو گیا اور آل علی کی حکومت کا سامان کرنے پر آمادہ ہو گیا لیکن اس کے نتیجہ میں قتل ہونا پڑا۔ بے دردی سے خون بہانے والے سفاح کی سلطنت بھی زیادہ نہ چلی۔ چار سال رہی اس کے بعد منصور دوانیقی کا زمانہ آیا۔ اب سلطنت ذرا اور جم چکی تھی اس نے حضرت علی کی اولاد کے ساتھ جو جو ظلم کئے ان سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہیں۔ بقول سیوطی منصور پہلا شخص ہے جس نے علویوں اور عباسیوں میں عداوت کا بیج بویا اس سے پہلے ان دونوں میں اتفاق تھا۔ امام حسن اور امام حسین کی اولاد مدینہ میں عزلت گزینی اور عسرت میں بسر کرتی اور سلطنت کے معاملات میں الگ تھلگ رہتی تھی، وہ علمی اور فلسفی باتوں میں مشغول رہتی تھی۔ خصوصاً ائمہ اہل بیت صرف اپنے نانا کے دین کو فروغ دینے اور خلق خدا کو ہدایت کرنے کے کام میں لگے رہتے تھے۔ ادھر تو بنی عباس و بنی امیہ کی یہ ملکی جنگ جاری تھی اور ادھر اس بنا پر اولاد رسول کو ذری فرصت مل گئی۔ تقیہ کا دباؤ ہلکا پڑ گیا۔ چنانچہ وہ فلسفہ جو محمد مصطفیٰ لائے تھے اور سینہ بہ سینہ اپنے آباء و اجداد سے ائمہ اہل بیت تک پہونچا تھا اب تک اور حکومت کے خلاف ہونے کے سبب قابل تعزیر تھا، اس کی تعلیم کا موقع ہاتھ آیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے دربار میں اتنے علماء و فضلاء جمع ہو گئے جن کی تعداد (چار ہزار سے زائد) تھی ان میں سے صرف ایک بزرگ جابر بن یزید جعفی کے متعلق علماء اہل بیت نے لکھا ہے کہ ان کو تیس ہزار ایسی حدیثیں یاد تھیں جو انہوں نے عام طور سے لوگوں سے بیان نہیں کی تھیں۔ جو بیان کی تھیں وہ ان کے علاوہ تھیں لیکن باوجود اس کے کہ ان کے لئے اورع

فی الحدیث بصدوق فی الحدیث اور بقول 'وکیع'

'مهما شککتم فی شی فلا تشکوا فی ان جابرا ثقة"

(چاہو جس بات میں شک کرلو لیکن اس میں کوئی شک نہیں
کہ جابر ثقہ تھے)

سب کچھ لکھا گیا پھر بھی ان کی حدیث اس بنا پر نہیں لکھی گئی کہ وہ شیعہ تھے۔
سلام بن مطیع کہتے ہیں کہ مجھ سے جابر جعفی نے کہا

"عندی خمسون الف باب من العلم ما حدثت به احدا"

(میرے پاس علوم کے پچاس ہزار باب ہیں جن کو میں نے کسی سے بیان نہیں کیا۔)
وہ بیان کر بھی کیونکر سکتے تھے ایک شخص نے پوچھا تھا کہ

"کیف تسلم علی المهدی"

جابر نے جواب دیا کہ

ان قلت لک کفرت

(اگر تم سے بتاؤں تو تم کافر کہہ دوگے یا کہہ دئے جاؤ گے) جابر سے احادیث نہ لینے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کا عقیدہ رجعت کا تھا (جو شیعوں کا امتیازی عقیدہ ہے اور احادیث شیعہ و سنی سے ثابت ہے) بعض لوگوں نے ان کا یہ جرم لکھا ہے

"رافضی یشتم اصحاب النبی صلی الله علیه وآله وسلم"

افسوس ایک شیعہ کو شیعہ ہونے کے سبب علوم کے بیان کرنے کی گنجائش نہ تھی اور ہر مذہب وملت کی آزادی کا راگ الاپنے میں کسی کو جھجک نہیں ہوتی اور لوگ اسے سننے اور لکھنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس طرح کتنے علوم سے دنیا محروم ہوگئی۔ بخاری صاحب نے خود امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت بھی قبول نہیں فرمائی۔ اور یہ آج ہی نہیں بلکہ حکومت کا درخت اس طرح لگایا گیا تھا۔ خود حضرت علی کے متعلق ایسا ہی ہوا آپ کا ترتیب دیا ہوا قرآن نہ لیا گیا۔

بہر حال اہل بیت سے سیکھنے والوں نے سیکھا اور ---۔ کتابیں مختلف احکام ومسائل پر لکھی گئی تھیں اہل بیت کا یہ علمی پایہ، ان کی انسانیت وزہد کی زندگی کہاں تک اثر نہ کرتی ان کی تنگدستی اور عسرت کے باوجود اہل شہر ان کی اس قدر زیادہ تعظیم کرتے تھے کہ کسی اور کی نہ کرتے تھے۔ اس سبب سے منصور کو خواہ مخواہ ان کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں لوگ گرویدہ ہوکر ان کو خلیفہ نہ بنالیں۔ اس سبب سے وہ ان کی تذلیل وتخریب کے درپے ہوگیا۔ سادات سے دشمنی کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس زمانہ میں بنی امیہ کی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ بنی ہاشم نے ایک جلسہ کرکے عبد اللہ بن حسن مثنیٰ ابن حسن بن علی کے بیٹے محمد کو جو اپنی نیک سیرتی کی وجہ سے نفس زکیہ کہلاتے تھے، خلیفہ انتخاب کرلیا تھا اور خود منصور نے جو اس جلسہ میں شریک تھا ان کی بیعت کرلی تھی مگر امام جعفر صادق علیہ السلام اس جلسہ میں شریک نہ تھے۔ آپ اس جلسہ کے خلاف تھے۔ جب منصور بادشاہ ہوگیا تو اس بیعت کا خیال کرکے اسے اور اندیشہ ہوتا تھا۔ چنانچہ قتل، غارت ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ علوم کا ترجمہ اور فلسفہ کے داخلہ کی بھی اجازت دی تاکہ آل محمد اور ان کے تلامذہ کو علمی مباحثات کے ذریعہ شکست دی جاسکے۔

چنانچہ تذکرہ خواص الائمہ میں یہ لفظ ملتا ہے

کان المامون یمتحنه بالسوال عن کل امر فحیه الجواب

(ارجح المطالب باب ۳ صفحہ ۴۲۳)

اس سے ایک طرف تو بنی امیہ کی جہل پرستی ظاہر ہوتی تھی اور دوسری طرف جو عقائد بنی امیہ کے طرفداروں کے تھے جنہوں نے عوام کی زبان بند کر رکھی تھی اس میں رخنہ ڈالا جاتا تھا اور آل محمد کو زیر کرنے کے لئے دہری، وثنی، عیسائی، مجوسی، فلسفی، لامذہب لوگوں سے مناظرہ اور مباحثہ کرایا جاتا تھا لیکن الله متم نوره ہر موقع پر ایسے میدانوں میں آل رسول کی جیت ہی رہی بلکہ ان کے متوسلین اور اس سرچشمہ سے

سیراب ہونے والے فتح مبین حاصل کرتے رہے۔ بحارالانوار، احتجاج طبرسی، عیون اخبار رضا، کافی وغیرہ کتابوں میں یہ علمی معرکے بہ تفصیل موجود ہیں۔ لیکن عقل وفلسفہ کو ذری آزادی ملی اور اشاعرہ کا مذہب علی العموم مذہب حکومت تھا لامحالہ دم توڑنے لگا۔ یہ بھی یادرکھنے کی بات ہے کہ فلسفی، معتزلی، دہری غرض ہر مذہب کو آزادی تھی۔ لیکن اب بھی کوئی شخص اپنے آپ کو شیعہ نہیں ظاہر کرسکتا تھا۔ شیعوں کو فلسفی اور معتزلی بن کر بحثیں کرنا پڑتی تھیں۔ لیکن عام مروج مذہب کے ساتھ عقل وفلسفہ کی آزادی جمع نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر عقل اور فلسفہ پر زور دیا جاتا تو حکومت اور عقیدۂ اہل سنت کو رخصت کرنا پڑتا اور اگر مذہب کی پابندی کی جاتی تو فلسفہ وعقل رخصت ہوتی تھی۔ چنانچہ جن جن سلاطین نے آزادی دی یا عقل وفلسفہ کو جائز قرار دیا ان کی مذہبی حیثیت کو بٹہ لگ گیا لہٰذا جن سلاطین کو مذہبی حیثیت جمانے میں بھلائی معلوم ہوتی وہ ان آزادیوں پر پھر پہرہ بٹھلا دیتے اور جو ذرا منچلے ہوتے وہ اپنی تدبیروں سے پیشوائے مذہب بھی بنے رہتے اور اپنے دل کی حسرتیں بھی نکالتے رہتے۔ یونہی کبھی فلسفہ عقل کو عروج اور کبھی زوال نصیب ہوتا رہا۔ چنانچہ مہدی کے بعد ہارون کی حکومت ہوئی تو اس کو طوعاً وکرہاً فلسفہ کی قدر کرنی پڑی، مامون کے دور میں تو بہت زیادہ آزادی ہوگئی۔

تصنیفات ہشام

مامون کی حکومت دوسری صدی کے آخر سے شروع ہوتی ہے اور اس وقت سے مسلسل بڑے بڑے علمائے اسلام فلسفہ کے ماہر اور فلسفہ کے رو سے عقائد اسلامیہ کے موید اور فلسفیوں کی غلطی کو فلسفی ہی اصول سے واضح کرنے والے ہوتے چلے آئے۔ ہرچند فلسفہ اپنی اس بدنصیبی کو ساتھ لایا جس سے سابقہ اسے عہد مسیح سے قبل ہورہا تھا۔ پھر بھی جو بات مطابق عقل وفطرت ہو وہ کسی فتوے یا طاقت سے زیادہ دن تک دبائی نہیں جاسکتی اور صاحبان عقل اسے کسی نہ کسی عنوان سے سیکھ لیتے اور سکھا دیتے ہیں۔ موقع پاکر ہشام نے سیکھا اور دربار اہل بیت میں رسائی حاصل کرنے کے بعد اس پر جلا ہوگئی۔ ان کی ولادت کوفہ کی تھی۔ واسط میں پڑھے لکھے اور تجارت بغداد میں کی اور آخر عمر میں وہیں آگئے۔ امام جعفر صادق وامام موسیٰ کاظم علیہما السلام سے فیض حاصل کیا۔ امامت میں بحث کی راہ نکالی۔ علم کلام میں بڑے حاذق اور حاضر جواب تھے۔ ۱۹۹ھ میں بزمانہ رشید کوفہ سے بہشت عنبر سرشت میں تشریف لے گئے۔ ہشام کے تصنیفات میں سے مولانا شبلی نے چار کے نام لئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کے نام یہ ہیں:

كتاب الالات على حدوث الاشياء

كتاب الله بير، كتاب الميزان

كتاب في الجبر والقدر

كتاب المعرفه

كتاب الاستطاعة

كتاب الالفاظ

كتاب الرد علي المعتزله في امر طلحه و زبير

كتاب القدر

كتاب الالطاف

كتاب الرد علي معتزله

مذکور بالا کے علاوہ

كتاب الامامة

كتاب الرد علي من قال بامامة المفضول

كتاب اختلاف الناس في الامامة

كتاب الوصية والرد علي من انكره وغیرہ

ہشام بن حکم کے لئے جو مذکورہ بالا کتابوں کے مصنف ہیں ظاہر ہے کہ فضائے دہر تنگ تھی ،ان کی جلالت میں موافق ومخالف سب ہی رطب اللسان ہیں لیکن ان کے ساتھ تشیع کی مصیبت ایسی لگی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے نزدیک کسی طرح قابل عفو نہیں تھی ۔منکر خدا ورسول کو آزادی تھی اور ہے ،لیکن حضرت علی کو خلیفہ ماننے اور حضرت ابوبکر کی خلافت سے انکار کرنے کے بعد آزادی کا حق تو درکنار زندگی ہی کا حق حاصل نہیں (انصاف پسند اور غیر جانبدار تاریخ دیکھنے والے اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں)چنانچہ ان کو بدنام کرنے کی کوششیں بھی خوب خوب کی گئی ہیں ۔چنانچہ ملل ونحل میں علامہ شہرستانی نے بھی جی بھر کر زحمت فرمائی ہے لیکن ان کو مجسمہ میں شمار کر دیا ہے ۔انکے ایسے مباحثات جو تشیع سے متعلق نہ تھے ان پر تو مدعیان اسلام نے داد دی ہے لیکن جہاں تک تشیع کا تعلق ہے ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہے ہیں کہ ان کو پھانس دیں اور موت کے گھاٹ اتار دیں ۔میں نے ایک علیحدہ کتاب میں

''مناظرات ہشام'' کو جمع کیا ہے اوراس کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اہل بیت کے گھرانے سے متوسل کیسی کیسی مشکلوں میں مبتلا کیا جاتا ہے اور وہ حق کے ساتھ اپنی جان کس طرح بچاتا ہے ۔

چنانچہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا معویہ بدر میں شریک تھا؟

ہشام نے کہا **نعم في ذلک الجانب** (ہاں دوسری طرف سے)

تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ ایک شخص جو عقیدتاً شیعہ ہو اس کی زندگی مدعیان اسلام کی حکومت میں کتنی زیادہ مشکل بات ہے ۔لیکن ایسا شخص کہاں تک بچ سکتا ہے اور اگر علمی زور اور ذہانت سے بچ بھی جائے تو جب ارادہ ہی قتل کا حکومت کی طرف سے ہو چکا ہو تو کیا صورت حیات ہو سکتی ہے ۔

چنانچہ....

(اصل مسودے کے دو صفحات موجود نہیں)

....اسی زمانہ میں قیس ناصر بھی تھے جنہوں نے علم کلام امام زین العابدین علیہ السلام سے سیکھا تھا ،ان کی جلالت بھی نہایت درجہ کی تھی ۔بعض لوگوں نے تو ان کو "**احسن کلاما من هشام بن الحکم**" تک لکھا ہے ۔اسی عہد میں حمران بن اعین بھی تھے جنہوں نے امام زین العابدین علیہ السلام کی ملاقات بھی کی تھی ۔ان کے حق میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان کے انتقال کی خبر سن کر "**مات واللہ مومنا**" کہا ہے ۔ان کا کلام بھی اعلیٰ پایہ پر تھا نہ صرف کلام بلکہ خود حافظ قرآن بھی تھے اور ان کا نام خاص قاریوں میں بھی لیا جاتا ہے ۔

اسی عہد میں ابوجعفر محمد بن نعمان الاحول مومن طاق بھی ہیں جن کی صداقت اور حاضر جوابی سے اس زمانہ کے مخالفین تنگ تھے اور ان کو عداوت میں شیطان الطاق کہتے تھے ۔بعض شاہ طاق کہتے ہیں ۔طاق اس محلہ کا نام تھا جہاں ان کی دکان تھی ۔اور بعضوں کا خیال ہے کہ سکوں کی پرکھ اور کھرے کھوٹے کے اتنے زیادہ ماہر تھے کہ ان کو اس وجہ

سے شیطان کہا جاتا تھا۔ گویا اتنی زیادہ مہارت انسان کو نہیں ہوتی بلکہ جنوں کو ہو سکتی ہے اور غیر معمولی لیاقت دانوں کو جن کہا جاتا ہے۔ خصوصیت سے انکے وہ مناظرے جو ابوحنیفہ صاحب سے ہوتے ہیں وہ سب قابل دید ہیں۔ ان کی کتابوں میں

کتاب الائمه

کتاب المعرفة

کتاب الرد علی المعتزله فی امامة المفضول

کتاب الجمل فی امر طلحه و الزبیر و عائشه

کتاب اثبات الوصیة

بھی ہیں۔ ہشام بن حکم کے شاگرد ابوجعفر محمد بن خلیل سکاک جن کو چھریاں بنانے کے سبب سکاک کہا جاتا ہے۔ ہشام کے بعد ہوئے۔ انہوں نے ہشام سے تعلیم حاصل کی تھی اور متکلم تھے۔ ان کی کتابوں میں ایک

کتاب الامامة بھی ہے۔ اور

مناظرات اور

کتاب المعرفة

کتاب الا سطاعة

کتاب الرد علی من ابی وجوب الامامة بالنص ۔

مولانا شبلی صاحب کہتے ہیں

"علم کلام کی ترقی کے ذکر میں خاندان نوبخت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ فضل بن نوبخت ہارون الرشید کے خزانۃ الحکمۃ کا افسر تھا۔ اور فارسی زبان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ اسماعیل جو نوبخت کا پوتا تھا بہت بڑا عالم اور علم کلام کا ماہر تھا۔ اس کے ہاں ایک خاص مجلس مقرر ہوا کرتی تھی

جہاں متکلمین جمع ہوتے تھے اور مسائل کلام پر مباحثے کرتے تھے۔ علم کلام میں اس کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے کتب ذیل کا تذکرہ ابن الندیم نے کیا ہے۔

کتاب ابطال القیاس

نقض کتاب عبث الحکمة علی الراوندی

نقض اتاج علی الراوندی

کتاب تثبیت الرساله

اسماعیل کا بھانجا حسن بن موسیٰ اس خاندان میں سب سے زیادہ نامور ہوا ابن الندیم نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ متکلم بھی تھا اور فلاسفر بھی۔ فلسفہ یونان کی بہت سی کتابیں اسی کے حکم اور اہتمام سے ترجمہ کی گئیں۔

فضل بن نوبخت کی اور کتابوں کا ذکر قفطی نے اپنی کتاب اخبار الحکماء میں کیا ہے جو موالید اور نجوم سے متعلق ہیں جن سے ان کا تبحر دیگر علوم فلسفیہ میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس خاندان میں اسحاق بن ابی سہیل، ابواسحاق بن اسحاق، محمد بن اسحاق، یعقوب بن اسحاق، مشہور علمائے فلسفہ وکلام گزرے ہیں۔

تصنیفات اسماعیل بن علی بن نوبخت

اسماعیل بن علی بن نوبخت دینی و دنیاوی جلالت کے مالک تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں منجملہ ان کے

کتاب الاستقاء فی الامامة

کتاب التنبیه فی الامامة

کتاب الرد علی الیهود

کتاب الرد علی ابی العتاهیه فی التوحید فی شعره

کتاب الخصوص والعموم

کتاب الانسان

کتاب الرد علی الواقفه

کتاب الرد علی الغلاة، کتاب التوحید

کتاب الارجاء

کتاب المحاسبة مع ابی علی الجبائی بالاهواز

کتاب فی استحالة روية القديم تعالیٰ

کتاب الرد علی المجبره فی المخلوق والاستطاعة

کتاب نقض مسئله ابی عیسیٰ الوراق فی قدم الاجسام مع اثباته الاعراض

کتاب حدوث العالم، کتاب الرد علی اصحاب الصفات

وغیرہ ہیں۔

محمد بن عبدالرحمٰن بن قبہ رازی جن کی کنیت ابوجعفر ہے عظیم القدر متکلم تھے اور علم کلام میں مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ یہ پہلے معتزلی تھے بعد میں شیعہ ہوگئے تھے۔ اپنے زمانے میں شیعوں کے بزرگ مانے جاتے تھے۔ ان کی ایک کتاب الامامة ہے۔ ایک کتاب التعریف علی الزیدیہ ہے۔

اسی زمانہ میں ابوالحسین محمد بن بشر سہروردی ہمدونی بھی تھے جو متکلم جید الکلام تھے۔ نہایت عابد تھے، پیدل پچاس حج کئے تھے۔ ان کی بھی ایک کتاب کتاب الامامة ہے۔ ابوالحسین کہتے ہیں کہ میں امام رضا کی زیارت سے فارغ ہوکر ابوالقاسم بلخی کے پاس گیا۔ میرے ساتھ ابن قبہ کی **کتاب الامامة** جس کا نام انصاف ہے، تھی۔ ابوالقاسم کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کی رد میں "**المسترشد فی الامامة**" لکھی۔ جب میں واپس آیا تو وہ کتاب ابن قبہ کو دی انہوں نے اس کی رد میں "**المستثبت فی الامامة**" لکھی۔ جب میں یہ کتاب لے کر ابوالقاسم کے پاس پہونچا تو انہوں نے "**نقض المستثبت**" لکھی اب جو میں واپس آیا تو ابوجعفر کا انتقال ہو چکا تھا۔ سہروردی ابوسہل نوبختی کے غلاموں میں سے تھے۔ اور آل حمدون کی طرف منسوب ہوکر حمدونی بھی مشہور ہیں۔ ان کی بھی کئی کتابیں ہیں منجملہ ان کے "**کتاب المنقذ یا انقاذ فی الامامة**" بھی ہے۔

محمد بن احمد عبداللہ بن قضاعہ صفوانی جنکی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ یہ صفوان بن مہران جمال کی اولاد سے تھے (صفوان امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے) بلا کے حافظ تھے۔ نہایت ٹھوس بولنے والے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امی تھے ان کی ایک کتاب بھی ہے، جس کو انہوں نے لوگوں کو زبانی لکھوا دیا ہے۔ ان کی اور کتابیں بھی ہیں مثلاً

کتاب الکشف والحجه

کتاب المتعة و تحلیلها والرد علی من حرمها

کتاب صحبة آل الرسول" وغیرہ۔

ملک سیف الدولہ حمدانی کی بارگاہ میں ان کی بہت عزت تھی۔اس کی بنا یوں ہوئی تھی کہ انہوں نے قاضی موصل سے ابن حمدان کے سامنے امامۃ کے بارے میں مناظرہ کیا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ انہوں نے قاضی سے کہا کہ آؤ مباہلہ کرلیں۔قاضی صاحب نے دوسرے دن کا وعدہ کیا اب جو یہ لوگ آئے تو دونوں میں مباہلہ ہوا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔قاضی صاحب امیر ابن حمدان کے یہاں روزانہ آیا کرتے تھے۔اب دوسرے اور تیسرے دن نہ آئے امیر نے حال دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب جس وقت مقام مباہلہ سے اٹھے اسی وقت سے ان کو بخار آ گیا ہے۔اور جو ہاتھ مباہلہ کے لئے اٹھا تھا وہ سوج گیا ہے اور سیاہ ہو گیا ہے۔چنانچہ اس کے دوسرے دن قاضی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر مشہور ہو کر بادشاہ تک پہونچی اور اس روز سے صفوانی کی منزلت بادشاہ کے یہاں بہت بڑھ گئی۔(دیکھو رجال نجاشی صفحہ ۲۷۹ طبع .....)ان کی بھی بہت سی کتابیں ہیں منجملہ ان کے

کتاب ثواب القرآن

کتاب الرد علی ابن رباح

کتاب الرد علی الواقفه

کتاب الرد علی اهل الاهواء

کتاب الغیبة

وغیرہ میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ۳۴۶ھ میں مجھ سے اور صفوانی سے ملاقات ہوئی تھی نہایت قد آور اور خوش پوشاک آدمی تھے۔ان سے احمد بن نوح نے ۳۵۲ھ میں روایت کی ہے جس سے معلوم ہوا کہ ۳۵۲ھ تک زندہ تھے۔

منجملہ متکلمین مظفر بن محمد خراسانی ہیں جن کی کنیت ابوالجیش ہے۔ابو سہل

نوبختی کے شاگرد اور شیخ مفید کے استاد تھے۔ان کی تصنیفات میں کتاب المثالب ہے جس کا نام

قد فعلت فلا تلم ہے اور کتاب

نقض کتاب العثمانیه للجاحظ' ہے۔

کتاب الاعراض والنکت فی الامامه

وغیرہ ہے۔ان کا انتقال ۳۶۷ھ میں ہوا۔

منجملہ متکلمین یحییٰ العلوی ابو محمد نقیب النقباء نیشاپور ہیں جو بنی زباب میں تھے،آپ امام زین العابدین علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔یحییٰ کے والد ابوالحسین محمد کی جو عالم و زاہد بھی تھے۔نیشاپور میں بیعت خلافۃ بھی کی گئی تھی مگر چار مہینے میں ختم ہو گئی اور ۳۳۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔بہر حال یہ سید جلیل القدر فقیہ و متکلم تھے۔ ان کی کتابیں سب ذیل ہیں۔

کتاب المسح علی الرجلین

کتاب فی ابطال القیاس

کتاب فی التوحید

منجملہ متکلمین ابو منصور صرام ہیں جو نیشاپور میں اجلہ متکلمین میں تھے۔ان کے بہت سے تصنیفات ہیں منجملہ انکے

کتاب بیان الدین

کتاب فی ابطال القیاس

کتاب فی تفسیر القرآن (یہ کافی بڑی کتاب ہے)

علامہ طوسی کہتے ہیں کہ میں نے کتاب بیان الدین کا اکثر حصہ ابو حازم کے سامنے پڑھا جنہوں نے خود مصنف کے سامنے قرائت کی تھی۔

مجملہ متکلمین داود بن اسد ملقب بہ احوص ہیں۔ایک زیارت کے موقع پر

حائر میں ان سے حسن بن موسیٰ نوبختی کی ملاقات بھی ہوئی تھی اور انہوں نے ان سے کچھ حاصل بھی کیا۔

منجملہ متکلمین محمد بن عبداللہ بن ملک الاصفہانی بھی ہیں جو اصلاً جرجانی تھے۔ پھر اصفہان میں آکر رہ گئے تھے۔ پہلے یہ معتزلی تھے پھر عبدالرحمٰن بن احمد بن جرویہ کے ہاتھ پر شیعہ ہو گئے۔ یہ بھی صاحب تصنیف بزرگ تھے۔

منجملہ متکلمین ابن عبدک میں جو جلیل القدر متکلم اور فقیہ تھے۔ ان کی کتابوں میں

کتاب التفسیر

اور

کتاب الرد منجملہ متکلمین علی الاسماعیلیہ' بھی ہیں۔

منجملہ متکلمین ابن ابی عقیل عمانی بھی ہیں ان کا نام حسن بن عیسیٰ اور کنیت ابوعلی اور مشہور بہ عمانی ہیں۔ یہ بھی منجملہ اجلہ متکلمین اور صاحب تصانیف ہیں۔

ان کے علاوہ محمد بن قبہ رازی جو پہلے معتزلی تھے بعد میں شیعہ ہو گئے تھے متکلمین امامیہ میں ہیں اور ان کی کئی کتابیں امامت کے بارے میں ہیں۔

تصنیفات فضل ابن شاذان

ان کے علاوہ فضل بن شاذان فقیہ اور متکلم جلیل القدر تھے۔ جن کی کتابوں میں

کتاب المسائل الاربع فی الامامة

کتاب الرد علی ابن کرام

کتاب المتمتعین متعة النساء و متعة الحج

کتاب الوعید و مسائل فی العالم و حدوثه

کتاب الاعراض و الجواهر

کتاب الرد علی الدامغة الثنویه

کتاب الرد علی المثلثه

کتاب الرد علی المرجئة

کتاب الرد علی الباطنیه و القرامطه

کتاب التنبیه فی الجبر و التشبیه وغیرہ ہیں۔

اور ابن ندیم نے ان کے بعض تصنیفات بنا بر مذہب عامہ بھی ذکر کئے ہیں منجملہ انکے

کتاب التفسیر

کتاب القراءة

کتاب السنن فی الفقه' وغیرہ ہیں۔

کتب محمد ابن عمیر

ان کے علاوہ محمد بن ابی عمیر جنہوں نے ساتویں آٹھویں نویں امام علیہم السلام کا زمانہ پایا تھا جن کے لئے اوثق الناس، اورع، اعبد، انسک کے الفاظ جاحظ نے البیان والتبیین میں لکھے ہیں۔ ابن بطہ نے ان کی ۹۴ کتابوں کا ذکر کیا ہے منجملہ انکے

کتاب الاستطاعة و الافاعیل والرد علی اهل القدر والجبر

کتاب الامامة

کتاب البداء

'**کتاب المتعه**' ہیں۔

ان کو مامون نے قید کر دیا تھا اور بیان کیا جاتا ہے ان کی بہن نے کتابوں کو غیبت وحبس کے زمانہ میں بغرض حفاظت چار برس اور بقولے سترہ برس تک دفن کر دیا تھا۔ چنانچہ کتنی کتابیں برباد ہوگئیں اس کے بعد جب ان کو موقع ملا تو یاد تو جتنا یاد پڑا یا جو پہلے لوگوں کو بتلا چکے تھے ان روایتوں کو بیان کرتے تھے۔ اسی بناء پر ان کی مراسیل پر علماء کو اطمینان ہے۔ ان کو سندی بن شاہک نے ایک سو بیس چوب ہارون کے سامنے شیعہ ہونے کے جرم میں ماری اور قید کیا چنانچہ ایک لاکھ اکیس ہزار درہم فدیہ دے کر جان بچائی انکا انتقال ۲۱۷ھ میں ہوا۔

اس طرح علماء کلام کی فہرست ہر امام کے عہد میں نمایاں موجود ہے۔ مختصر یہ کہ امام زین العابدین علیہ السلام کے عہد سے امام محمد تقی علیہ السلام تک کا زمانہ چونکہ فلسفی نشو ونما کا کہا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں شیعوں نے بھی فلسفہ وکلام میں نمایاں حصہ

لیا اور فلسفی آزادی کے بہانے اپنے عقائد کو جو ائمہ اہلبیت سے سیکھے تھے لوگوں میں پھیلا دئے۔ امام رضا علیہ السلام کے فیض صحبت ہی کا اثر تھا کہ تمام بنی عباس میں مامون کا عقیدہ سب سے زیادہ شیعوں کے عقیدہ سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ مورخین نے اس کو معتزلی لکھا ہے چونکہ معتزلی مذہب عقل سے قریب تر تھا اس زمانہ میں معتزلہ کو کمال عروج ہوا۔ مامون بھی اشعری مذہب کا ساتھ نہ دے سکا۔ شیعہ اور معتزلہ کی طرح خلق قرآن کا قائل تھا اور اشاعرہ کی طرح ازلی نہ سمجھتا تھا۔ انسان کو فاعل مختار، خدا کی صفات کو عین ذات مانتا تھا اور حشر کے روز اس جسمانی آنکھ سے خدا کی رویت سے انکار کرتا تھا۔ چونکہ اسلام کی ترقی اور سلامتی انہیں عقائد کی قبولیت عامہ پر سمجھتا تھا اس نے ان کو اپنی سلطنت میں رواج دینے کی ظاہراً کوشش کی۔ چنانچہ مختلف موقعوں پر خصوصاً ۲۱۲ھ میں اس نے اپنی سلطنت کے بڑے بڑے عالموں کا (مثل امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، محمد بن سعد کاتب، قواریری، بشر بن ولید کندی، ابن ہرس، ابونصر تمار، ابو مسلم، اور یزید بن ہارون کے) خاص مسئلہ قرآن میں امتحان لیا۔ سوائے احمد بن حنبل کے سب نے تلوار کے خوف سے تقیہ کر کے خلق قرآن کا اقرار کر لیا۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن معین کہا کرتے تھے کہ ہم نے مسئلہ خلق قرآن کو صرف تلوار کے خوف سے مانا ہے۔

چونکہ مامون پر عقلی عقیدہ کا بہت کچھ اثر تھا اور نری سلف پرستی شعار نہ تھی۔ اس نے عام مروج عقیدہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے متعہ کی حلت کا بھی اعلان کر دیا۔ مگر علماء کی مخالفت سے رکنا پڑا۔ اس نے یہ بھی اعلان کرایا کہ جو شخص معاویہ کا ذکر بخیر کرے ہم اس کی حفاظت سے دست بردار ہیں۔ اور بعد رسول اللہ حضرت علی تمام خلائق سے افضل ہیں۔ ان باتوں کے بعد ظاہر ہے کہ مامون کی سنیت مقدوح ہونا ہی تھی۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے اس کو لکھا کہ مامون نے تشیع کا اعلان کر دیا۔ عقد فرید میں ایک مناظرہ کا ذکر ہے جو مامون نے اپنی سلطنت کے بڑے بڑے علماء کو جمع

کر کے سر دربار کیا تھا اور اس میں نہایت نمایاں فتح حاصل کی تھی اور حق یہ ہے کہ اس کے استدلال کا جواب ممکن ہی کب تھا۔ علامہ شبلی نے اس کو مامون کی زور طبیعت قرار دیا ہے لیکن صاحبان علم وانصاف اس کا فیصلہ آسانی سے کر سکتے ہیں کہ صرف طباعی تھی یا حق حقیق۔

بنی عباس کی سلطنت کے علاوہ جس نے اس علم کو رونق بخشی وہ دیالمہ تھے۔ یہ لوگ چوتھی صدی کے ابتدائی زمانہ میں تھے۔ علامہ شہرستانی نے لکھا ہے

"و اما رونق علم الکلام فابتدائه من الخلفاء
العباسیه هارون والمامون والمعتصم والواثق
والمتوکل و انتهائه من الصاحب بن عباد و
جماعة من الدیالمیه"

(علم کلام کی رونق کی ابتداء ہارون، مامون، معتصم، واثق، متوکل خلفاء عباسیہ سے ہوئی۔ اور صاحب بن عباد اور دیلمیون کی ایک جماعت پر اس کی انتہا ہو گئی)

صاحب آداب اللغۃ عربیہ (ج ۲ صفحہ ۲۲۰) لکھتے ہیں کہ ان میں سے مامون، معتصم اور واثق کو اعتزالی الخیال کہا گیا ہے اور اسی بناپر آزادیاں رہیں اور متوکل کی طرف سے سختیاں۔ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ اصل یہ ہے کہ جو مذہب علی العموم مروج تھا وہ اشعری اور سنی تھا اور اس میں عقل وفلسفہ کو چونکہ تشفی بخش سامان نہیں ملتا تھا لہٰذا جس کسی پر عقل وفلسفہ کا رنگ غالب آجاتا وہ اعتزال کے نام سے پناہ ڈھونڈھتا لیکن وہاں پہونچکر اسے اپنے مذہب سے ہاتھ دھونے کی نوبت آتی یا عوام اور متعصب علماء کے خوف فتنہ سے کھل کے اعتزال کے اصول کا اظہار بھی ناممکن تھا۔ اس بناپر جس نے فلسفہ وعقل سے کام لیا وہ مذہبی نہ رہ سکا یا بے دین کہا گیا اور جس نے ایسا نہ کیا وہ حامی سنت قرار دیا گیا جیسا کہ متوکل کے لئے حمایت سنت کی سند عطا ہوئی۔ ملاحظہ ہو

تاریخ الخلفاء سیوطی ص

بہرحال دیالمیہ نے نہ صرف علم کلام کو رونق بخشی بلکہ جملہ علوم وفنون کی جیسی سرپرستی، تعلیم وترویج اور حوصلہ افزائی اس عہد میں ہوئی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

صاحب بن عباد جن کا نام ابوالقاسم اسماعیل بن عباد بن العباس بن عباد بن احمد بن ادریس الطالقانی ہے۔ ان کے فضائل ومناقب کی کوئی تھاہ نہیں ملتی۔ ثعالبی نے یتیمۃ الدہر میں لکھا ہے اس سے ابن خلکان نے نقل کیا ہے کہ "مجھے ایسے الفاظ نہیں ملتے جن سے میں صاحب بن عباد کے علم وادب کی منزل کی بلندی کو اور ان کے جود وکرم اور محاسن میں یکتائی اور قابل فخر امور کے جامع ہونے کی جلالت شان کو ظاہر کرسکوں۔۔الخ۔" صاحب بن عباد ۳۲۶ھ میں پیدا ہوئے ۳۸۵ھ میں انتقال کیا۔ ان کے علمی کارنامے اور علوم وفنون کی سرپرستی کا حال بیان کرنے کو دفتر کے دفتر چاہئیں۔ ان کی تو حیثیت وزیر کی تھی اور دیالمیہ سلاطین تھے۔ لیکن نہ صرف وزیر ہی تھے بلکہ دولت علم سے بھی مالا مال تھے اور ان کی ہنر پروری کے واقعات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

فیلسوف کامل فارابی

اس زمانہ کے مشہور حبان بن فضل و کمال میں مسعودی، فارابی، ابوالفرج اصفہانی وغیرہ سے کون صاحب علم ہے جو واقف نہیں ۔ یہ سب اپنے فن کے امام ہیں ۔ ان میں فارابی کی جامعیت اور خصوصاً منطق و فلسفہ کی منزل نہایت بلند ہے ۔

محمد بن محمد بن طراخان ابونصر فارابی مما لک ترک کے ایک شہر فاراب کا رہنے والا تھا ۔ لیکن بغداد کو وطن بنالیا تھا ۔ بقول جورجی زیدان

> ''فارابی فیلسوف کامل تھا ۔ وہ تمام علوم پڑھے تھے جو کندی نے حاصل کئے تھے اور ان میں سے اکثر میں کندی سے فوقیت لے گیا تھا علی الخصوص منطق اور تحلیل و فلسفہ میں نہایت گہرائی تک پہونچ گیا تھا ۔ اکثر کتابیں ان موضوعوں پر لکھیں جن پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا مثلا اس کی ایک کتاب ''علوم کا احصا اور ان کے اغراض کا بیان'' ہے اس کتاب کو لغت علمیہ کہا جاسکتا ہے ۔ اس کی شکل ایسی تھی جیسے علوم کا انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) اس سے پہلے یہاں تک کوئی نہیں پہونچا تھا نہ کسی نے لکھا تھا ۔ اسی طرح کتاب ''سیاست مدنیہ'' جو اقتصاد سیاسی (Political Economics) ہے جس کے متعلق جدید تمدن والوں کا خیال ہے کہ وہ ان کی ایجاد ہے حالانکہ فارابی نے ایک ہزار

> برس پہلے لکھ دیا ہے ۔ اس کے بعد پھر اپنے مقدمہ میں ابن خلدون نے اس کو لکھا ہے ۔''

تحقیق میں فارابی اپنے اقران سے بہت اونچا تھا قفطی نے اس کی ستر سے زائد کتابوں کے نام گنائے ہیں ۔ مولانا شبلی صاحب نے الکلام میں فارابی کے ان مسائل کا مختصراً ذکر کیا ہے جن میں شریعت اور فلسفہ کی تطبیق کی گئی ہے ۔ صاحب مجالس المومنین نے اس کو شیعہ شمار کیا ہے ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا استدلال کہاں تک صحیح ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اشعری نہیں تھا، نہ کوئی فلسفی ہو سکتا ہے اس کے مسائل کو غور سے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا رجحان کس طرف تھا ۔ فارابی کی علمی بلندی کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب معلم اول کہا جاتا ہے تو ارسطو سمجھا جاتا ہے اور جب معلم ثانی کہا جاتا ہے تو اس سے مراد فارابی ہوتا ہے ۔

شیخ الرئیس ابوعلی سینا کی عظمت

علمائے فلسفہ وکلام میں اگر بوعلی سینا کا نام نہ لیا جائے تو یہ کھلا ہوا ظلم ہے۔ شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا خرمیثیا میں جو بخارا کے علاقہ میں ہے۔ ماہ صفر ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا اور ماہ رمضان روز جمعہ ۴۲۸ھ میں ہمدان میں انتقال کیا۔

اس مشہور حکیم کے فضائل لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ ایسا فلسفی اور حکیم چشم فلک نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔ اس کی مافوق العادۃ قوتوں اور علمی جلالت کے کارناموں سے تاریخیں مالا مال ہیں۔

بعض لوگوں نے امیر نوح بن نصر سامانی کو کتابوں کے جلانے کا بے جا الزام اس پر لگایا ہے۔ جس کو صاحب کشف الظنون نے باقاعدہ رد کیا ہے اور اس کو "بہتان وافک" بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو کشف الظنون باب الحاء علم الحکمۃ۔ ابن سینا پیدائشی طور پر مافوق العادۃ قوی احساسات لے کر آیا تھا۔ جب بہت چھوٹا تھا تو اس کی ماں کہیں جانے لگی اور بغرض حفاظت ایک چھلنی سے ڈھانک دیا اور اس وقت جو آسمان دیکھا وہ اس کے غیر معمولی حافظہ میں باقی رہ گیا۔ چنانچہ جب گویائی کا زمانہ آیا تو کہا کرتا تھا کہ اس نے مشبک آسمان بھی دیکھا ہے۔ بصارت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ زہرہ سے آفتاب کا کسوف دیکھا تھا۔ اسی طرح قوت سامعہ وذائقہ وغیرہ کے قصے مشہور ہیں۔ پس برس کے سن میں قرآن عزیز کا علم محکم طریقہ سے حاصل کر لیا تھا۔ سولہ برس کے سن میں علوم طبیعی والٰہی اور دیگر علوم میں اتنا ماہر ہو گیا کہ اس کی کوئی نظیر نہ تھی۔ اور اس کے سامنے بڑے علم اور سن والے زانوئے تلمذ تہ کرنے لگے۔ اپنے زمانہ تعلیم میں کسی

رات کو پوری رات نہ سویا۔ جب اسے کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو وضو کر کے جامع مسجد میں جاتا اور نماز پڑھ کر خدائے عزوجل سے دعا کرتا کہ اس کو سہل کر دے۔ (مقام عبرت ہے کہ اتنا بڑا فلسفی تو خدا کا اس طرح قائل ہو اور آج فلسفہ کے الف کا نام بھی نہ جاننے والے خدا کے منکر اور اپنے آپ کو اس کی مدد سے مستغنی سمجھتے ہوں۔ اسی کا نتیجہ بھی یہ ہے کہ حقیقت کے گرد قدم کو بھی نہیں پہونچتے) مرنے کے قریب جب مرض نے طول پکڑا تو ابن سینا نے مایوسی کا اعلان کر دیا۔ پھر غسل کر کے توبہ کی۔ اور جہاں تک معلوم ہو سکا رد مظالم کیا۔ اس کے بعد اس کے پاس جو کچھ تھا اس کو فقراء پر تصدق کر دیا۔ اور اپنے غلاموں کو آزاد کیا۔ اور قرآن پڑھنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ تین دن میں ایک ختم کرنے لگا اور یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ انتقال کیا۔

اس کے تصنیفات کی تعداد تقریباً بیان کی جاتی ہے جن میں سے ۲۶ صرف فلسفہ میں ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف شفا یا صرف قانون اسو (۱۰۰) نہیں بلکہ بجائے خود ہزار تصنیف ہیں۔

مولانا شبلی صاحب نے لکھا ہے

> "فارابی کے بعد بوعلی سینا نے اس مضمون (الٰہیات وفلسفہ اسلام) کو زیادہ وسعت دی۔ اس نے حکیمانہ مذاق پر قرآن مجید کی بعض سورتوں کی تفسیر لکھی۔ شفا اور اشارات میں نبوت، معاد، خلق شر، دعا کی تاثیر، عبادات کی فرضیت وغیرہ پر نہایت عمدہ مضامین لکھے اور ان چیزوں کو دلائل عقلی سے ثابت کیا۔ اس موقع پر یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے کہ امام غزالی نے بوعلی سینا کو اس بنا پر کافر کہا ہے کہ وہ معاد جسمانی کا قائل نہ تھا۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ معاد جسمانی کا انکار کفر کا مستلزم ہے یا نہیں مزے کی بات یہ ہے کہ بوعلی سینا معاد جسمانی کا صاف صاف معترف ہے۔ الٰہیات شفا میں

معاد جسمانی کی نسبت لکھتا ہے:''

"و قد بسطت الشريعة الحقة التی اتانا بها نبينا و سيدنا مولانا محمد صلی الله عليه و آله حال السعادة و الشقاوة التی بحسب البدن"

پس سچی شریعت نے جو ہمارے پیغمبر، ہمارے سید، ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ لے کر آئے جسمانی عذاب وثواب کا حال نہایت تصریح سے بیان کیا ہے۔''

شریعت کا ایک بڑا عقدہ جو بوعلی سینا نے حل کیا وہ معجزات اور خرق عادات کی بحث تھی۔ انہیں آج کل بھی یہ رنگ ہے کہ فلسفہ کی تھوڑی سی تعلیم رکھنے والے اس پر ایمان لا کر شرعیات کو غلط ٹھہراتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ بڑے بڑے ماہرین اس باب میں محتاط نظر آتے ہیں۔ اسپنسر جیسا آدمی جو حال کے طبیعین کا سرتاج خیال کیا جاتا ہے مادہ کے متعلق اپنی کتاب ''اصول اولیہ'' میں یہ اقرار کرتا ہے کہ ''مادہ کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنا بھی مثل دیگر چیزوں کی حقیقت اور اصلیت کے عقل انسانی سے بالاتر ہے۔''

ایسی صورت میں قابل غور ہے کہ اگر علوم الٰہیہ کا ماہر مادہ کو فانی کہے جو چیزوں کی حقیقت اور اصلیت کا مکمل علم رکھتا ہے تو وہ قابل قبول ہوگا یا اس کے خلاف کہنے والوں کا۔ اصل یہ ہے کہ تھوڑے علم والے جلد ابل پڑتے ہیں۔ اسی طرح ہر زمانہ میں ہوتا آیا ہے۔ لیکن آخر کار ثابت ہو کے وہی رہتا ہے جو شریعت حقہ کہتی ہے البتہ عقلی وفلسفی علم میں مہارت وکمال کی شرط ہے۔ جیسا کہ شیخ الرئیس نے حل کر کے دکھلایا ہے۔

حکمۃ وطبیعیات میں شیخ الرئیس بوعلی سینا کے نو مختصر رسالے یکجا ''مطبعہ جوائب'' قسطنطنیہ ۱۲۹۸ھ میں طبع ہوئے ہیں۔ اس میں ایک جگہ قوۃ طبیعیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے

جہاں طبیعین اور جو لوگ ان سے مشابہ ہیں وہ اس بات کی لم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ فلاں مرکب میں فلاں خاصیت کیوں ہے.... چونکہ ان نقلی فلسفیوں کو اصول معلوم نہیں ہیں لہٰذا وحی ومعجزات انبیاء علیہم السلام کا انکار کردیتے ہیں۔ حالانکہ حکماء میں سے جو لوگ محققین ہیں چونکہ ان امور میں انہوں نے گہری نظر ڈالی ہے اور انتہائی حد تک غور وفکر کی ہے وہ ان چیزوں کے وجود کو ضروری جانتے ہیں اور جو لوگ ان لوگوں کے درجۂ تحقیق تک پہونچے نہیں مگر پہونچا چاہتے ہیں وہ ان باتوں کے ممکن ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن درجۂ اولی (محققین کاملین) کے مشہور حکما کی تعداد نہایت کم ہے۔ چنانچہ جہاں تک مجھے علم ہے چھ ہزار برس کی مدت کے مدعیان فلسفہ میں کامل محقق صرف تین یا چار ہیں۔ اسی بنا پر عام لوگوں کے اس علم (فلسفہ) میں دخل دینے کو ہم ناپسند کرتے ہیں کیونکہ اولاً اس کی صلاحیت رکھنے والے کم ہیں پھر ان میں سے جو لوگ مکمل کوشش کریں وہ اور بھی کم ہیں اور فراغت کے بعد اس پر ثابت قدم رہنے والے تو بہت ہی کم۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ گمراہی سے ہم کو بچائے اور ہمیں سیدھے راستہ پر چلائے اور ادعائے فضیلت سے محفوظ رکھے۔''

شیخ الرئیس کے اس بیان سے یہ واضح ہے کہ وحی ومعجزات کا انکار محققین کا کام نہیں ہے بلکہ شبیہ الفلاسفہ کا کام ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ سرمایہ تحقیق کے خزینہ دار نہایت کم ہوتے ہیں چنانچہ شیخ کی سی واقفیت کا انسان چھ ہزار برس کی مدت میں محقق کی تعداد صرف تین یا چار بتلاتا ہے۔ اس امر کی طرف بھی اشعار ہے کہ اس قسم کے شرعیات کے انکار میں ادعائے فضیلت کارفرما ہوتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ شہرت

کی خواہش انسان کو حق واضح کا منکر بنا دیتی ہے اور نہ جانے کیا کیا کہلا دیتی ہے۔اسی طرح ''رسالہ علوم عقلیہ'' کو ختم کرتے ہوئے شیخ نے یہ لکھا ہے کہ

''ہم نے اقسام حکمت کی رہنمائی کر دی اس سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ ان میں کوئی بات ایسی نہیں جو مخالف شرع ہو۔ لہٰذا یقیناً وہ لوگ جو حکمت (فلسفہ) کا ادعا کر کے شاہراہ شریعت سے مڑ جاتے ہیں وہ اپنی ذات سے گمراہ ہوتے ہیں اور اپنی عاجزی اور تقصیر کے سبب ایسا کرتے ہیں ورنہ یہ علم اس کا باعث ہرگز نہیں ہے بلکہ حکمت ایسے لوگوں سے بیزار ہے''

شیخ کے ان اقوال کے بعد فلسفہ اور شریعت کا تضاد تو ہوا ہو گیا البتہ ناقص علم والوں یا غلط عقیدہ والوں کی غلطی ثابت رہی۔اس موقع پر فلسفہ و حکمت کے آفتاب علامہ ابن مسکویہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔

مسکویہ کا علمی مرتبہ

شیخ ابوعلی الخازن احمد بن محمد بن یعقوب الملقب بہ مسکویہ کا مرتبہ علمیہ بھی نہایت سربلند ہے۔خصوصاً آپ کا فلسفی کامل ہونا اظہر من الشمس ہے۔مولانا شبلی لکھتے ہیں:

''اسی زمانہ میں احمد بن مسکویہ المتوفی ۴۲۱ھ پیدا ہوا جس نے فلسفہ اور شریعت کی تطبیق پر ایک خاص کتاب لکھی۔وہ علوم فلسفیہ کا بڑا ماہر تھا۔فلسفہ یونان کی واقفیت میں فارابی اور ابن رشد کے سوا اور کوئی اس کا ہمسر نہیں گذرا۔اس کی تصنیفات میں سے تہذیب الاخلاق مصر و ہندوستان میں اور تجارب الامم جو ایک تاریخی تصنیف ہے، یورپ میں چھپ گئی ہے۔فلسفہ و شریعت کی مطابقت میں اس نے دو کتابیں لکھیں۔الفوز الاصغر، الفوز الاکبر۔پہلی کتاب بیروت میں چھپ گئی ہے اور ہمارے پیش نظر ہے۔اس کتاب میں تین اہم مسائل سے بحث کی ہے۔(۱) وجود باری اور صفات باری، (۲) روح کی حقیقت اور اس کے خواص، (۳) نبوت ۔اس کتاب کا انداز بیان بخلاف ابن سینا کے نہایت صاف اور شستہ ہے اور یہ ابن مسکویہ کا عام انداز ہے۔چونکہ یہ کتاب نہایت جامع و مانع اور مختصر ہے اس لئے ہم اسکے ضروری مباحث کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں''

اس کے بعد مولانا شبلی نے وہ مطالب نقل کئے ہیں اور آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ

> علامہ ابن مسکویہ نے وحی اور مشاہدات اور مسموعات انبیاء کی جو حقیقت بیان کی امام غزالی نے "**المضنون به على غير اهله**" میں اس کو اپنے لفظوں میں ادا کیا ہے۔"

اس سے واضح ہو گیا کہ شریعت و فلسفہ کی تطبیق کا کام امام غزالی سے پہلے ایک شیعہ عالم نے ایسے انداز میں کیا جسے امام غزالی نے ایسا پسند کیا انہیں مطالب کو اپنے لفظوں میں اتار لائے۔ ممکن ہے کہ اسی عقلی استدلال کا اثر ہو کہ علامہ غزالی نے اشعری عقیدہ عوام کے لئے اچھا قرار دیا لیکن عقلی اور خواص کا عقیدہ چھپانے کے قابل قرار دیا۔

علامہ ابن مسکویہ رازی الاصل، اصفہانی المسکن والمدفن تھے۔ صاحب کتاب الشیعہ و فنون الاسلام نے لکھا ہے کہ

> وہ جامع علوم اور ہر علم میں باکمال اور ہر ایک میں مصنف تھے۔ اصل کتاب میں میں نے ان کا ذکر اور ان کی کتابوں کی فہرست لکھی ہے۔ یہ وزیر مہلبی کے مصاحب تھے اسکے بعد عضد الدولہ ابن بویہ کے اس کے بعد ابن عمید کے مصاحب تھے۔ پھر ان کے بیٹے کے ہمراہ رہے۔ روضات میں ان کا سنہ وفات ۴۳۱ھ لکھا ہے۔ ان کی قبر اصفہان کے محلہ خاجو میں مشہور ہے۔"

علامہ جورجی زیدان نے تاریخ آداب لغۃ عربیہ ج ۲ صفحہ ۳۱۷ پر لکھا ہے

هو من النوابغ المتفكرين العاملين الذين يندر ظهورهم في الامم

یعنی وہ منجملہ ان سربلند صاحبان فکر و نظر اور باعمل لوگوں کے ہیں جن کا وجود (صدیوں نہیں بلکہ) امتوں میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ان کو متقدمین کے علوم کی معرفت تامہ حاصل تھی۔ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ زیدان نے ان کی ایک اور کتاب "کتاب آداب العرب والفرس" کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں

مصنف کا انداز بیان ہے۔ جیسا ایک ادیب فلسفی (اخلاق فاضلہ کا ماہر فلسفہ دان) کا ہونا چاہیے۔ اس کتاب کی چھ جلدیں ہیں جس میں عرب، فارس، ہند اور یونان کے اخلاق و آداب سے بحث کی گئی ہے۔

علامہ جورجی زیدان نے علماء اسلام میں جن لوگوں پر فلسفہ غالب تھا ان کا ذکر کرتے ہوئے شیخ بوعلی سینا اور امام غزالی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ غزالی نے ۵۰۵ھ میں انتقال کیا۔ وہ ملقب بحجۃ الاسلام تھے۔ اور وہ امام تصوف ہیں لیکن حق یہ ہے کہ غزالی اپنے تصانیف میں اتنے رنگ بدلتے رہے ہیں جس کی حد نہیں۔ اسکا سبب کیا تھا اسے غور کرنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ شبلی صاحب کی عبارت تو یہ ہے

> "البتہ اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ امام صاحب کی تصنیفات ہر علم میں ہیں اور ہر جگہ وہ نیا قالب بدل لیتے ہیں۔ وہ کہیں متکلم ہیں کہیں فقیہ، کہیں واعظ کہیں فلسفی اس لئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ واقعی ان کا کیا خاص مشرب ہے اور کیا اعتقادات ہیں۔ انکی تمام تصنیفات جب جمع کی جائیں اور ایک کو دوسرے سے ملایا جائے اور ان کے اشاروں کی مخفی زبان سے آشنائی ہو تب یہ راز کھل سکتا ہے۔"

پھر لکھتے ہیں:

> "امام غزالی نے اگرچہ علماء ظاہر کے ڈر سے نہایت احتیاط اور پردہ داری سے کام لیا تاہم سمجھنے والے سمجھ گئے کہ وہ فلسفہ کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ اس بنا پر بڑے بڑے نامور علماء مثلاً قاضی عیاض، محدث بن جوزی، ابن قیم وغیرہ نے ان کی ضلالت اور گمراہی کی تشہیر کی۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ ایک امام غزالی پر موقوف نہیں اشعری المذاق علماء کی کتابوں میں تضاد بیانی اور تناقض الخیالی (علی الخصوص جب علم کلام کی نوبت آتی ہے)

عام طور سے شائع و ذائع ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے جب مذہبی تعلیمات و اعتقادات کا دباؤ پڑتا ہے تو عقل میں نہ آسکنے والی باتوں کا عقیدہ بیان کرتے ہیں اور جب بدیہی عقل امور اور فلسفی استدلال پیش نظر ہوتے ہیں تو مطابق عقل نظریوں کا اظہار ہوتا ہے (جو اشعریت کے مذہب کے سراسر خلاف ہوتا ہے) پہلے بھی مولانا شبلی کی عبارت نقل کی جا چکی ہے اور مذکورہ بالا عبارت میں بھی صاف اعلان کر دیا گیا ہے کہ علماء ظاہر کے ڈر سے پردہ داری سے کام لیا گیا۔ اصل راز یہی ہے کہ اگر عقلی اور واقعی حقیقت ظاہر کرتے ہیں تو جمہور اور ان کی سلف پرستی جان لیتی ہے اور ''بڑے بڑے نامور علماء'' گمراہ کہکر دائرۂ مذہب سے نکال باہر کرتے ہیں۔ اور اگر سلف کے روایات پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں تو عقل ساتھ نہیں دیتی اور دل کو سکون نہیں ہوتا۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ امام غزالی کو ہر جگہ قالب بدلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ واعظ کا تصادم فقیہ سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آدمی جس فن میں چاہے کتاب لکھے اور جتنے فن میں چاہے لکھے ہدایت وگمراہی کا مسئلہ تو عقائد وکلام میں آتا ہے۔ اشعری بنتے ہیں تو فلسفی نہیں رہ سکتے، معتزلی بنتے ہیں تو اشعریت رخصت ہوتی ہے۔ عقل سے کام لیتے ہیں تو محدثین کی روایتیں مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔ ''خدا مجسم بھی نہیں ہے اور عرش اس کے بار سے چرچراتا ہے'' بھلا کس عقل میں سما سکتا ہے۔ خدا عادل بھی ہے اور تکلیف مالا یطاق دے کر اس کے تعمیل نہ کرنے والوں کو سزا دے گا یہ کس کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ بات امام غزالی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ذرا زیادہ نمایاں کر دی گئی ہے ورنہ صاحبان واقفیت جانتے ہیں کہ ان کو بھی اس حال سے کم حصہ نہیں ملا۔ کاش دنیا غور کرتی کہ واقعی عقلی مذہب کون ہے۔ علامہ غزالی کو تو معلوم نہیں مولانا شبلی کس طبقہ میں جگہ دیتے ہیں محدثین کے سے عقائد والے یا فلسفیین کے سے عقائد والے۔ عام لوگوں کو جو عقیدہ رکھ کر نجات ہوگی وہ یا جو عقیدہ عوام کے خلاف ہے وہ۔ یہ فیصلہ ہم قارئین کے حوالے کرتے ہیں۔

علامہ جورجی زیدان نے لکھا ہے کہ

,,مسلمانوں پر فلسفہ نے جو اہم تاثیر کی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اسی علم پر علم کلام کی بنیاد قائم کی اور فلسفہ سے اس کی تائید

کی۔,,

پھر لکھتے ہیں کہ

,,علم کلام مسلمانوں میں پھیل گیا اور یہ لوگ اس کے درس میں منہمک ہو گئے۔ خصوصاً معتزلہ علم کلام میں .... بہت سے لوگ مشہور ہوئے۔''

منجملہ انکے شریف مرتضٰی، زمخشری اور باقلانی وغیرہ ہیں۔

علم الہدیٰ سید مرتضیٰ

افسوس ہے کہ شیعوں کو آج تک نہایت کم موقع دیا گیا کہ وہ بھی آزادی سے اپنی رائے ظاہر کر سکتے اور انکو حکومتوں کے دباؤں میں زندگی کا محفوظ کرنا ایک مستقل اور اہم مسئلہ تھا اس لئے ان کی کتابیں عام طور سے لوگوں تک نہیں پہونچیں اور جو پہونچیں بھی تو "قلم در کف دشمن است" کے ماتحت ادل بدل کے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مسلمین عموماً اور علمائے اسلام خصوصاً فیصلہ میں اس قسم کی غلطی کر بیٹھتے ہیں جیسا کہ شریف مرتضیٰ کو معتزلی کہنا جورجی زیدان سے۔ بات یہ ہے کہ دنیا بھر میں ایک طرف تو یہ مشہور کیا گیا کہ اسلام فقط اشعریت کا نام ہے اور سنت والجماعت کے مقابلہ میں ایک دوسرا مذہب بھی ہے جو معتزلی ہے تو جو کوئی عقل کی کہتا ہے اسے معتزلی کہے بغیر ان کو اور کوئی حل نظر نہیں آتا ورنہ شیعہ کہیں تو لوگوں تک یہ آواز بھی پہونچے گی اور واقعات پر روشنی پڑے گی۔

دوسری طرف شیعوں کو خالص شیعہ نقطۂ نظر کے اظہار میں امام غزالی سے بھی زیادہ ڈر رہا لہٰذا شیعوں کو بھی کسی سنی گروہ میں شامل کر دیا گیا۔ جورجی زیدان غریب تو پھر بھی عیسائی ہے، علامہ ابن حجر نے علامہ حلی کو شافعی کہہ دیا ہے۔ قابل غور ہے کہ کوئی شیعہ کس طرح شافعی ہو سکتا ہے جبکہ شافعی کا اہلسنت ہونا بدیہی ہے۔ اس زمانہ کے سید علی بہلاوی نے بھی اسی قسم کی غلطی **"اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع"** میں کی ہے جو ان کی تصحیح و ترمیم سے چھپی ہے۔ صاحب کشف الظنون نے جناب شیخ طوسی کو شافعی لکھا ہے۔ جب مسلمانوں کا یہ حال ہو تو ایک عیسائی جس کا دارومدار بھی صرف سنی ہی کتابوں پر ہو اگر اس قسم کی غلطی کرے تو تعجب خیز نہیں۔ بہر حال شریف مرتضیٰ کا علم کلام و فلسفہ بلکہ دیگر علوم اسلامیہ میں جو مرتبہ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کے

حالات کی اجمالی تصویر کشی کے لئے بھی بہت بڑے دفتر کی ضرورت ہوگی۔ ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ کم از کم **تنقیح المقال** معروف بہ رجال مامقانی ملاحظہ کریں۔ صرف تاریخ ولادت و وفات کا ذکر کر کے ہم اس ترجمہ کو کتب مطولہ کے حوالہ کرتے ہیں۔ آپ کا اسم مبارک علی بن الحسین بن موسیٰ اور لقب ابوالقاسم مرتضیٰ اور علم الہدیٰ ہے۔ رجب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الاول ۴۳۶ھ میں انتقال فرمایا۔ بغداد کاظمین میں اپنے جد بزرگوار امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے روضہ کے قریب آپ کا مقبرہ ہے۔ اور تھوڑے فاصلہ پر آپ کے چھوٹے بھائی کا مقبرہ ہے جو اب نہایت شاندار بن گیا ہے۔ علم الہدیٰ کے تصنیفات میں امالی اور شافی کو کافی شہرت ہے۔

علمائے کلام و فلسفہ میں علم الہدیٰ کا نام لینا اور ان کے استاد شیخ مفید علیہ الرحمہ کا تذکرہ نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ آپ کی علمی و عملی بلندی اور جلالت مرتبت کا تذکرہ بھی بخیال طول حذف کیا جا رہا ہے۔ آپ کا اسم مبارک محمد بن محمد بن نعمان، کنیت ابوعبداللہ اور لقب ابن معلم اور مفید ہے۔ ۱۱/ذی قعدہ ۳۳۶ھ میں ولادت اور شب جمعہ ماہ رمضان ۴۱۳ھ میں وفات ہوئی۔

ان حضرات کے علاوہ شیخ کمال الدین میثم بن علی بن میثم بحرانی شارح نہج البلاغہ جن کا انتقال ۶۷۹ھ میں ہوا۔

محقق طوسی نصیر الدین محمد بن محمد بن حسن طوسی صاحب تجرید و شرح اشارات جن کا انتقال ۶۷۲ھ میں ہوا۔

جمال الدین ابوالمنصور حسن بن یوسف بن علی علامہ حلی صاحب شرح تجرید جن کا انتقال ۷۲۶ھ میں ہوا۔

قطب الدین رازی صاحب محاکمات جن کا انتقال ۷۶۶ھ میں ہوا۔

میر محمد باقر بن میر شمس الدین محمد حسینی الاصفہانی مشہور بہ میر باقر داماد صاحب افق المبین جن کا انتقال ۱۰۴۱ھ میں ہوا۔

غفرانمآب جناب مولانا سید دلدار علی صاحب عماد الاسلام جن کا انتقال ۱۲۳۵ھ میں ہوا۔

جناب مفتی محمد قلی خاںصاحب صاحب تشیید المطاعن جن کا انتقال ۱۲۶۰ھ میں ہوا اور مولانا سید ظہور حسین صاحب القول الشافی، التوحید، العدل، النبوۃ وغیرہ (بزبان اردو) جن کا انتقال ۱۳۵۷ھ میں ہوا۔

فلاسفۂ اسلام و علماء کلام میں سے چند کے نام ہیں جن کا فلسفہ وکلام اور دیگر علوم اسلام میں نہایت بلند پایہ تھا اور کلام کے علاوہ دیگر علوم میں بھی ان کے جلیل القدر تصنیفات موجود ہیں۔ اس طرح عہد سرور کائنات سے آج تک مسلسل فلسفہ وکلام کا اسلام سے گہرا تعلق رہا اور آئندہ بھی رہے گا۔ بس افسوس اس کا ہے کہ جو مذہب عقل و فلسفہ کے بالکل مطابق پڑتا ہے گردش زمانہ نے اس کی مقبولیت و شہرت کو دبائے رکھا اور اس کے خلاف ایسا پروپیگنڈا کیا کہ گویا صفحۂ عالم پر اس کا وجود ہی نہیں۔ دعا ہے کہ پروردگار عالم تحقیق پسند افراد کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ فرق اسلامیہ میں ہر ایک کی کتابیں دیکھ کر بہتر میں سے ایک کو صحیح طور سے منتخب کریں جو نجات کا ضامن ہے۔

تمت